مبادیاتِ تحقیق

عبدالرزاق قریشی

تذکرہ وتعارف مع اضافہ

پروفیسر عبدالستار دلوی

انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

۹۲ ردادا بھائی نوروجی روڈ، ممبئی-۴۰۰۰۰۱

Symbol of Secularism & National Integration

مبادیاتِ تحقیق

عبدالرزاق قریشی

تذکرہ وتعارف مع اضافہ

پروفیسر عبدالستار دلوی

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

۲۰۱۴ء

Symbol of Secularism & National Integration

یہ کتاب اردو سافٹ ویئر اِن پیج پروفیشنل کے اوریجنل ورژن میں ٹائپ کی گئی ہے۔

انجمن اسلام پبلیکیشنز سیریز (جدید) : ۳
©جملہ حقوق بحق انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

Mubadiyat -e- Tehqeeq (Eliments of Research)
by : **Abdur Razzaq Qureshi**
with introduction by : **Prof. Abdus Sattar Dalvi**
Published by : Anjuaman-i-Islam Urdu Research Institute, Mumbai
2nd Edition Published in : 2014 - Price : Rs. 100/-

نام کتاب : مبادیاتِ تحقیق
مؤلف : عبدالرزاق قریشی (مرحوم)
ناشر : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی، انجمن اسلام کمپلیکس،
ڈی.این.روڈ، ممبئی۔۱، فون: 022-2651354
ای میل: anjuman_uri@rediffmail.com
اشاعت ثانی : اپریل ۲۰۱۴ء
سرِ ورق : جاوید یوسف
کمپیوگرافی وطباعت : غزالی ٹائپ سیٹرس اینڈ پرنٹرس، ممبئی
contact.ghazali@gmail.com
قیمت : ۱۰۰/روپئے
ملنے کے پتے ۱۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی
انجمن اسلام کمپلیکس، دادا بھائی نوروجی روڈ، ممبئی۔۴۰۰۰۰۱
۲۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، علی گڑھ اور
پرنسس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، ممبئی۔۳
۳۔ نئی کتاب پبلشرز
اوکھلا مین، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

تحقیقی مقالہ میں کوئی علمی مسئلہ حل کیا جاتا ہے یا کوئی نئی بات کہی جاتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو بات کہی جائے وہ بنیادی طور پر نئی ہو۔ ایک بات پہلے کہی جا چکی ہے۔ اس میں جدید معلومات کا اضافہ بھی تحقیق ہے۔ جو بات پہلے کہی گئی ہے اگر اس میں غلطی یا غلطیاں ہیں تو ان کی تصحیح بھی تحقیق ہے۔ مسئلہ کے کسی نئے پہلو پر بحث کرنا یا روشنی ڈالنا بھی تحقیق ہے۔ کسی طے شدہ مسئلہ پر دوبارہ روشنی ڈالنا بھی تحقیق ہے۔ قدیم تحقیقات کو، وہ علم کی کسی شاخ سے تعلق رکھتی ہوں، نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ ترقی کا سرا اگر تلاش کیا جائے تو وہ ماضی کے دھندلکے میں ملے گا۔ (اس کتاب سے اقتباس)

ابتدائیہ

ڈاکٹر ظہیر قاضی
(صدر انجمن اسلام، ممبئی)

انجمن اسلام مسلمانان ممبئی کا ممتاز تعلیمی ادارہ ہے جو جسٹس بدرالدین طیب جی اور ناخدا محمد علی روگھے (دوّم) کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ یہ ادارہ ۱۸۷۴ء میں قائم کیا گیا۔ اس کا بنیادی مقصد مسلمانان ممبئی میں ثانوی تعلیم کا فروغ تھا۔ اس کے ابتدائی زمانے میں جو بزرگ اس سے متعلق ومنسلک تھے ان میں جسٹس بدرالدین طیب جی اور ناخدا محمد علی روگھے کے علاوہ منشی غلام محمد اور محی الدین دلوی (اولین دو سیکریٹری) قمرالدین طیب جی اور عبداللہ دھرمسی کے نام بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ عبداللہ دھرمسی کے زمانے میں ۱۸۹۷ء میں جب وہ انجمن اسلام کے سیکریٹری تھے، انجمن اسلام ہائی اسکول کی عالی شان عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ یہ پرشکوہ عمارت اپنے اسلاف کی انتھک کوششوں اور تعلیمی مقصد سے لگن کی ایک مثالی یادگار ہے جسے ممبئی میں Heritage Building ہونے کا شرف حاصل ہے۔

انجمن اسلام نے اپنی شاندار تاریخی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے بعد کے زمانے میں بھی اسے قائم رکھا اور عصری ضروریات کے ساتھ اپنے کاموں میں توسیع کی۔ لڑکوں کی تعلیم

کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی توجہ کی، پھر اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا جو مسلمانوں کی لسانی، ادبی اور تہذیبی شناخت کی ایک علامت ہے۔ اس سلسلے میں انجمن اسلام کے سابق صدر جناب سیف طیب جی اور ان کے رفقا ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار اور پروفیسر آصف اے اے فیضی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

ماضی میں ادارے کے ڈائرکٹر پروفیسر نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور ادارے کے رفیق جناب عبدالرزاق قریشی کی اعلیٰ تحقیقی کاوشیں علمی دنیا کے سامنے پیش کرنے کا شرف انجمن اسلام کو حاصل رہا ہے، جس کی علمی دنیا نے بڑی پذیرائی کی یہ کتابیں حوالہ جاتی کتابوں کے طور پر مختلف یونیورسٹیوں میں شامل نصاب رہی ہیں۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر عبدالستار دلوی کی اس اہم اور مفید کتاب کی جانب توجہ دلانے اور اصرار پر انجمن اسلام نے اس کتاب کی دوبارہ اشاعت کا فیصلہ کیا۔ اصولِ تحقیق پر جناب عبدالرزاق قریشی کی ایک عرصے سے نایاب کتاب ''مبادیاتِ تحقیق'' بیش قیمت اضافے کے ساتھ دوبارہ پیش کرتے ہوئے انجمن اسلام خوشی محسوس کر رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت تحقیقی ذوق رکھنے والے طلبا اور اساتذہ کی راہبری اور رہنمائی میں اضافہ کا سبب بنے گی۔ انشاء اللہ انجمن اسلام آئندہ بھی علمی، تحقیقی اور ادبی کتابیں پیش کرتا رہے گا۔

ممبئی
۲۱ر فروری ۲۰۱۲ء

ظہیر قاضی
(صدر انجمنِ اسلام، ممبئی)

تعارف وتذکرہ

اردو میں علمی اور ادبی تحقیق کی روایت تقریباً ۲۰۰ سال کی ہے۔ سرسید کی آثار الصنادید، علمی تحقیق کا نقطۂ آغاز ہے۔ سرسید کے رفقا نے اپنے ذوق وشوق کی مناسبت سے تحقیق کو موضوعات کے اعتبار سے وسیع تر کیا۔ اس سلسلے میں محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی، شمس العلماء ذکاء اللہ اور امداد امام اثر کے نام بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ عبدالسلام ندوی کی شعرالہند اور شمس اللہ قادری کی قدیم اردو کا تعلق بھی اسی سلسلے سے ہے بعد میں اپنی اپنی دلچسپیوں کے مطابق علمی اور ادبی تاریخ کو مختلف اشخاص نے آگے بڑھایا۔ بیسویں صدی کے ربع اول کے بعد ہمارے علمائے ادب نے یوروپ میں جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہ غالباً پہلی بار جدید سائنسی، علمی وادبی تحقیق سے متعارف ہوئے۔ پروفیسر محمود شیرانی، پروفیسر عبدالستار صدیقی، پروفیسر مولوی محمد شفیع، پروفیسر محی الدین قادری زور اور ڈاکٹر اقبال، یہ چند نام ہیں جنہوں نے یوروپی طرزِ تحقیق کو اپنایا اور ہندوستان میں جدید علمی اور ادبی تحقیق کو پروان چڑھایا۔ انہی کی رہنمائی اور علمی آگہی کا نتیجہ ہے کہ یونیورسٹی اور کالجوں میں بھی اردو میں علمی و ادبی تحقیق کا سائنسی انداز سے آغاز ہوا اور اصول تحقیق پر

غور وخوض شروع ہوا اور مضامین لکھے گئے تا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا کی رہنمائی ہو سکے۔ لیکن اب بھی اردو تحقیق کا اہم طالب علم اپنے ذوق وشوق کی مدد سے تحقیقی کاموں میں مصروف ہے لیکن وہ صحیح معنوں میں اصول تحقیق کی علمی آگہی سے محروم ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اصول وتحقیق اور تدوین متن کے لئے اردو میں مضامین اور کتابیں لکھی جاتیں۔ تدوینِ متن بھی تحقیق کا ایک اہم حصہ ہے۔ لیکن تحقیق کی یہ شاخ بھی ہماری نظروں سے اوجھل رہی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سنسکرت زبان وادب کے حوالے سے انگریزی میں کافی مواد موجود تھا۔ اردو، فارسی اور سنسکرت اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں تحقیق کے حوالے سے مختلف رویے اور مختلف مسائل ہونے کی وجہ سے، جس میں رسم الخط بھی شامل ہے، طریقۂ کار میں فرق ہے۔ تاہم کچھ بنیادی باتوں میں اشتراک کے پہلو بھی موجود ہیں۔ اس پس منظر میں ادبی اور علمی تحقیق کے اصول اور طریقۂ کار پر رہنمایانہ کتابوں کی اشد ضرورت تھی۔ اس بات کا شدید احساس ہمارے یونیورسٹی کے اساتذہ اور شعبۂ تحقیق سے وابستہ اسکالروں کو ہوا اور ساتھ ساتھ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نامور محقق استاد محترم عبدالرزاق قریشی صاحب کو بھی ہوا جن کے پاس عام طور سے طلبا مشورے کے لئے جاتے تھے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر انھوں نے مبادیاتِ تحقیق تحریر کی جو انھوں نے تحقیق کے بنیادی اصولوں، یوروپی یونیورسٹیوں میں تحقیق کے طریقۂ کار اور دوسری کتابوں کی مدد اور اپنے تجربے کی بنیاد پر تصنیف کی۔ قریشی صاحب کی اس بہت ہی اہم اور بنیادی کتاب کے بعد بیرسٹر قاضی عبدالودود، ڈاکٹر شوکت سبزواری، مالک رام وغیرہ نے اصول تحقیق کے بارے میں مضامین لکھے۔ اس سلسلے کی ایک اہم کتاب رہبرِ تحقیق کے نام سے شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی نے شائع کی جو مختلف مضامین پر مشتمل ہے۔ بعد میں رشید حسین خان، ڈاکٹر تنویر علوی، ڈاکٹر گیان چند جین نے تحقیق کے مختلف پہلوؤں پر اپنے مضامین کتابی صورت میں شائع کئے۔ شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی نے ۱۹۸۲ء میں اپنے قیام کے بعد ''ادبی اور لسانی تحقیق: اصول وطریقۂ کار'' کے نام سے شائع کی اور ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی وقیع اور ضخیم کتاب فنِ تحقیق شائع کی۔ متنی تنقید کے لحاظ سے شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی نے مشہور عالم، محقق اور مرتب متن پروفیسر نذیر احمد کو مدعو کیا اور انھوں

نے تحقیق اور تصحیح متن پر تین خطبات پیش کیے جسے شعبہ اردو نے شائع کیا۔ یہی کتاب بعد میں پاکستان سے بھی دوبارہ شائع ہوئی ۔ بہرحال حقیقت یہ ہے کہ عبدالرزاق قریشی مرحوم کی کتاب ''مبادیات تحقیق'' اردو میں اردو تحقیق کے اصول وضوابط اور طریقۂ کار پر پہلی کتاب ہے جو اپنی اہمیت اور تحقیق میں سائنسی ادراک کی بنیادی اور اہم ترین کتاب کی حیثیت سے ہمیشہ یادگار رہے گی۔

عبدالرزاق قریشی صاحب، ضلع اعظم گڑھ میں بستی بسہم کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد قریشی صاحب بمبئی تشریف لائے اور انجمن اسلام ہائی اسکول میں درس و تدریس سے وابستہ ہوئے ۔ وہ انجمن اسلام اسکول کے ممتاز اور معروف اساتذہ میں سے تھے۔ انھیں اردو زبان وادب اور اسی طرح فارسی زبان سے بھی شغف تھا اور درس وتدریس کے ساتھ وہ زبان وادب کی تحقیق میں مصروف رہتے تھے۔ اس زمانے میں بمبئی کے اردو کے اساتذہ میں تین (۳) اساتذہ اپنی زبان دانی اور درس وتدریس میں مہارت اور طلبا کی ذہنی تربیت اور ادبی ذوق وشوق کو پروان چڑھانے میں مشہور تھے۔ ان میں قریشی صاحب کے علاوہ احمد سیلر اسکول کے استاد محمد بشیر صاحب اور بیگ محمد کے فاضل استاد مولانا جالب مظاہری کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تینوں اساتذہ کو اسکولی سطح کی اردو تدریس اور تاریخ کے لئے شہرت حاصل تھی۔

جس زمانے میں قریشی صاحب بمبئی تشریف لائے اسماعیل یوسف کالج ایک ممتاز تعلیمی ادارہ تھا جہاں اردو، فارسی، عربی اور اسلامیات کی تعلیم کا شہرہ تھا۔ ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن اس کالج کے پرنسپل تھے جن کا خود اردو، فارسی اور عربی کے ممتاز عالموں میں شمار ہوتا تھا۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی بھی اس کالج میں اردو کے پروفیسر تھے۔ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار عربی کے ممتاز عالم اور پروفیسر تھے اور اسی طرح پروفیسر داؤد پوتا بھی اس کالج سے متعلق تھے اور فارسی کے ممتاز عالم اور استاد کی حیثیت سے قدیم ریاستِ بمبئی میں، جس میں گجرات، سندھ اور کرناٹک کے کچھ حصے بھی شامل تھے، ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ قریشی صاحب کا اگرچہ ان سبھی اساتذہ سے قریبی رشتہ تھا لیکن وہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی سے زیادہ قریب آئے جو

دارالمصنفین ، اعظم گڑھ سے ہوتے ہوئے گجرات کالج (احمد آباد) اور پھر بمبئی کے مشہور اسماعیل یوسف کالج میں پروفیسر تھے۔ غالباً یہ رشتہ اس لحاظ سے بھی مضبوط ہوگیا تھا کہ قریشی صاحب اور ندوی صاحب میں اعظم گڑھ ایک قدر مشترک تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی اعزازی ڈائرکٹر سے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے کل وقتی ڈائرکٹر مقرر ہوئے تو عبدالرزاق قریشی ، ندوی صاحب سے مزید قریب ہوئے اور ان کے ذوقِ علمی اور تحقیق سے دلچسپی کی وجہ سے اسکول میں درس وتدریس کی بجائے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ان کا تقرر ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے عمل میں آیا اور اس طرح قریشی صاحب نے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے منسلک ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اپنی علمی اور ادبی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور ''مبادیاتِ تحقیق'' تصنیف کی جس کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ان کے تحقیقات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور انہوں نے دیوانِ عزلت اور مثنوی راگ مالا مرتب کی۔ راگ مالا متنی تنقید کے اصولوں کی پوری پابندی کے ساتھ مرتب کی۔ اسی طرح مختلف رسائل میں وہ مضامین لکھتے رہے۔ ان کے یہ مضامین تاثرات کے نام سے شائع ہوئے۔ ان مضامین میں سے کئی مضامین ایسے ہیں کہ جن سے انجمن اسلام کی تاریخ اور تعلیمی خدمات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے یا جس کے لئے وہ ایک مآخذ کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے ۱۹۵۶ء میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے سو سال مکمل ہونے کے بعد ''نوائے آزادی'' کے نام سے ایسی اردو نظموں کا گلدستہ مرتب کیا جو ابتدا سے لے کر ۱۹۵۷ء تک کی نظموں پر مشتمل تھا۔ یہ کام بھی قریشی صاحب کے گہرے مطالعے اور تحقیقی ادراک کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ قریشی صاحب نے دو اور اہم کتابیں مرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کا اردو کلام اور ''اردو کا تمدنی سرمایہ'' بھی تصنیف کی۔ اردو کا تمدنی سرمایہ اعظم گڑھ سے شائع ہوئی۔ قریشی صاحب اپنے طلبا میں بہت مقبول تھے اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے وقت انھوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ راقم الحروف سے بھی وہ شفقت کرتے تھے اور میرے کئی ابتدائی مضامین انہی کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے نوائے ادب میں

شائع ہوئے۔ بمبئی سے قریب تاریخی شہر سوپارہ کے انور منشی صاحب کا مضمون جب 'معارف' میں شائع ہوا تو عبدالرزاق قریشی صاحب نے اپنے ایک خط کے ذریعہ اس کی خوب تعریف کی اور اس کے علمی معیار کو بہت سراہا۔ یہ ان کی علمی کشادہ دلی تھی ورنہ چشم حسود کی بھی روایتیں ہمارے یہاں پائی جاتی ہیں۔ ان کے محبوب طلبا میں بمبئی کے مشہور ڈاکٹر اور جراح (سرجن) ڈاکٹر عبدالرحیم اندرے بھی ہیں جن کے وہ بڑے مداح تھے۔ اسی طرح میرے ایک دوست نادر کابلی جو بعد میں پاکستان منتقل ہو گئے، وہ بھی قریشی صاحب کے عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے شاگردوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ میرے ساتھی اور ہم جماعت نور محمد قریشی، عبدالستار مرچنٹ، شیخ احمد صرف چند نام ہیں جو ہمیشہ عبدالرزاق قریشی صاحب کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ قریشی صاحب نے ابتدا میں بمبئی میں اردو صحافت کی بھی خدمت کی اور مشہور سماجی خاتون اور گاندھی جی کی پیرو مسز کلثوم سایانی کے ہفت روزہ 'رہبر' کی بھی صحافتی خدمت کی۔ انھوں نے اسکول کے بچوں کے لئے نصابی کتابیں بھی مرتب کیں جو بمبئی کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان نصابی کتابوں کا معیار بہت بلند تھا۔ قریشی صاحب نے پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے انتقال کے بعد نوائے ادب کی بھی ادارت سنبھالی اور اس کے علمی معیار کو فزوں تر کیا۔ اپنی شاگردہ رقیہ انعامدار سے نوائے ادب کا اشاریہ بھی قریشی صاحب ہی کی دلچسپی کا ثمرہ ہے۔ ندوی صاحب، کے ۱۹۶۹ء میں انتقال کے بعد جب راقم الحروف کو اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ڈائرکٹرشپ کی پیش کش کی گئی تو قریشی صاحب اس پیش کش پر بہت خوش تھے۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ وہ اس پیش کش کے حصے دار بھی تھے۔ اپنی عمر کے آخری حصے میں وہ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں فیلو کی حیثیت سے چلے گئے لیکن عمر نے وفا نہیں کی اور ۳۰ر جولائی ۱۹۷۷ء کو اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔

قریشی صاحب کی زیر نظر کتاب 'مبادیاتِ تحقیق' ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبا میں بے حد مقبول رہی ہے۔ یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق کا بازار گرم ہے۔ ہر سال سینکڑوں طلبا پی ایچ ڈی کے لئے داخلہ لیتے ہیں اور اس نادر و نایاب کتاب کی تلاش میں رہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ بنیادی نوعیت کی یہ کتاب دستیاب نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے انجمن

اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اشاعتی پروگرام میں اسے شامل رکھا تا کہ طلبا اور اساتذہ دونوں اس سے فیضیاب ہوسکیں۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اس کی اشاعت کے لئے میں ڈاکٹر عبدالرحیم اندرے، رقیہ انعامدار (اب رقیہ ڈار) اور میرے دوست جناب شمس الدین آغا (لندن)، غلام حسین حملانی (ممبئی) نیز ڈاکٹر سعیدہ پٹیل (اسسٹنٹ ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی) اور ڈاکٹر معزّہ (قاضی) دلوی، شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی کا شکر گزار ہوں کہ ان کی دلچسپی اور عملی تعاون مجھے حاصل رہا۔ میں اپنے دوست ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب (شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کا ان کی علمی معاونت کے لئے شکر گزار ہوں۔ میں ڈاکٹر ظہیر قاضی، صدر انجمن اسلام کا بھی شکر گزار ہوں کہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی کے اشاعتی پروگرام میں ان کی دلچسپیاں شامل ہیں۔ امید ہے کہ اس کتاب کی اس دوسری اشاعت کو علمی اور ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ،
ممبئی

عبدالستار دلوی

۲۸ر جنوری ۲۰۱۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سرِ آغاز

یہ رسالہ نوجوان محققوں کے لئے لکھا گیا ہے، خواہ وہ شوقیہ مضامین لکھتے ہوں یا پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے مقالے تیار کرتے ہوں۔ ممکن ہے یہ یونیورسٹی کے بعض رہنماؤں کے لئے بھی مفید ثابت ہو۔ اس میں تحقیق کی مبادیات سے بحث کی گئی ہے اور عملی نقطۂ نگاہ اختیار کیا گیا ہے۔ تحقیق اب عام ہوتی جارہی ہے اور ٹیکنیکل شکل اختیار کرچکی ہے۔ اس لئے امید ہے کہ یہ رسالہ نوجوان محققوں کے لئے کارآمد ثابت ہوگا۔

رسالہ میں چند تجویزیں جو اردو دنیا کے لئے نئی ہیں، تجربہ کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ اگر انھیں قبولِ عام حاصل ہوسکا تو میری سعی مشکور ہوگی، ورنہ کم سے کم غور وفکر کا دروازہ تو کھل ہی جائے گا۔

یہ رسالہ فروری ۱۹۶۷ء میں تیار ہوگیا تھا لیکن بعض دقتوں کی وجہ سے اس کی طباعت میں دیر ہوئی اور اشاعت کی نوبت اب آرہی ہے۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی
۲۵/جنوری ۱۹۶۸ء

عبدالرزاق قریشی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مندرجات

۱- دیباچہ

۲- **باب**-۱ : فنِ تحقیق ۱۵

الف - تحقیق کیا ہے؟ ۱۵

ب - تحقیق کی خصوصیات ۱۷

ج - محقق کی خصوصیات ۲۲

د - وقت کی تقسیم ۲۶

ھ - تحقیق کی قسمیں ۲۷

۳- **باب**-۲ : لائبریری کا استعمال ۲۸

الف - ڈیوی ڈیسیمل سسٹم ۲۹

ب - رسالوں سے استفادہ ۳۳

ج - لائبریریوں کے مطبوعہ کٹیلاگوں سے استفادہ ۳۳

د - ہندوستان کی بعض اہم لائبریریاں ۳۵

۴- **باب**-۳ : آغازِ کار ۳۶

الف - موضوع کا انتخاب ۳۶

ب - مآخذ کی فہرست ۴۰

ج - بنیادی ذرائع ۴۱

	د	- سوالنامہ	۴۲
	ھ	- انٹرویو	۴۳
۵-	**باب-۴** :	مقالہ کی تیاری	۴۵
	الف	- پڑھنے کی اہمیت	۴۵
	ب	- نوٹ لینا	۴۹
	ج	- چارٹ، نقشے وغیرہ	۵۱
۶-	**باب-۵** :	مقالہ کی تسوید	۵۳
	الف	- مواد کی ترتیب	۵۳
	ب	- مقالہ کی تسوید	۵۷
	ج	- حاشیہ اور حوالہ (فٹ نوٹ)	۵۹
	د	- پی ایچ، ڈی کا مقالہ	۶۴
	ھ	- کتابیات یا فہرست مآخذ	۶۵
	و	- اشاریہ	۶۹
۷-	**باب-۶** :	تحقیق و تصحیح متن	۷۱
	الف	- تحقیق متن کی دشواریاں	۷۲
	ب	- الحاق کلام	۷۴
	ج	- محقق متن کی خصوصیات	۷۵
	د	- نسخوں کی تلاش اور حصول	۷۷
	ھ	- نسخوں کے مراتب	۷۷
	و	- متن کی تحقیق و تصحیح	۷۹
	ز	- مقدمہ یا تعارف	۸۲
	ح	- حواشی و تعلیقات	۸۳
	ط	- کتابیات اور اشاریہ	۸۴

باب ۱

فنِ تحقیق

تحقیق کیا ہے؟

ذہین آدمی غور وفکر کا عادی ہوتا ہے۔ زندگی کے عام مسائل سے متعلق عموماً اور جن مسائل سے اسے دلچسپی ہوتی ہے ان سے متعلق خصوصاً وہ سوچتا رہتا ہے یا سوچنے پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ فطرتاً ترقی پسند ہے اور اپنے حالات کو بدلنا یا بہتر بنانا چاہتا ہے، اس لئے اس کے دماغ میں نئے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں یا پرانے مسائل سے متعلق نئے نئے پہلو اور شکوک اس کے سامنے آتے ہیں۔ وہ ان مسائل کو حل کرنا یا شکوک کو دور کرنا یا یقین سے بدلنا چاہتا ہے۔ یہیں سے تحقیق کی ابتدا ہوتی ہے۔ منظم دماغ مسائل کو حل کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے اور اس وقت تک کوشش کرتا رہتا ہے جب تک وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ جائے۔ اس کے لئے مشتبہ بات ایک جاندار سوال یعنی تلاش بن جاتی ہے اور جذبۂ تحقیق سے مدعا کی جستجو پر آمادہ کرتا ہے تاکہ مبہم اور غیر معین بات واضح اور مستحکم ہو جائے۔[1] موجودہ سائنسی دور میں انسان ہر بات کا بدیہی ثبوت بھی چاہتا ہے اور تحقیق یہ ثبوت مہیا کرتی ہے۔ اسی لئے کرافورڈ نے تحقیق کی تعریف

۱۔ The Quest for Certainty, John Dewey، باب ۹، ص ۲۱۷

کے سلسلے میں کہا ہے کہ اس کی ابتدا کسی مسئلہ سے ہوتی ہے، پھر وہ مواد جمع کرتی ہے، اس کا تنقیدی تجزیہ کرتی ہے اور صحیح شہادت کی بنا پر کسی نتیجہ پر پہنچتی ہے۔[1]

وبسٹر کے لغت میں تحقیق (Research) کے یہ معنی بتائے گئے ہیں: محتاط یا سرگرم تلاش، گہری جستجو۔

انہماک کے ساتھ جستجو یا چھان بین؛ مخصوص یا عموماً ناقدانہ اور سیر حاصل تفتیش یا جستجو جس کا مقصد نئے حقائق کا انکشاف اور ان کی صحیح تاویل اور پھر نئے حقائق کے انکشاف کی روشنی میں مروجہ نتائج، نظریات یا قوانین پر نظر ثانی کرنا یا نئے یا نظر ثانی کئے ہوئے نتائج کا عملی استعمال وغیرہ، نیز کسی شخصیت یا مضمون یا اسی قبیل کی کسی دوسری چیز سے متعلق مخصوص چھان بین جس کے ذریعہ چھان بین کرنے والا اپنا انکشاف پیش کرے۔[2]

آکسفورڈ ڈکشنری نے تحقیق کے یہ معنی دیئے ہیں:

۱۔ کسی مخصوص چیز یا شخص سے متعلق گہری یا محتاط تلاش کا عمل

۲۔ کسی حقیقت کے انکشاف کی غرض سے محتاط غور وفکر یا کسی مضمون کے مطالعہ کے ذریعہ تلاش یا چھان بین، ناقدانہ یا سائنسی سلسلۂ تلاش۔

۳۔ کسی مضمون کی چھان بین یا مسلسل مطالعہ

۴۔ دوسری بار یا بار بار کی تلاش[3]

تحقیق حقائق کی تلاش ہے اس لئے آلمک کے قول کے مطابق ہر قسم کی تفتیش یا چھان بین کو جو بنیادی ذرائع سے کی گئی ہو، تحقیق کہا جا سکتا ہے۔[4]

لیکن محض مواود جمع کر لینا یا اسے ترتیب دے دینا تحقیق نہیں ہے۔ اسی طرح کسی حقیقت کا پتہ لگا لینا تحقیق نہیں ہے، بلکہ اس کے اثرات کا کھوج لگانا ضروری ہے کیونکہ تحقیق

۱۔ The Eizmets of Research, F. L. Whitncy، باب ۱، ص ۲۱

۲۔ Webster's New International Dictionary of the Eng. Langugae، چاپ دوم

۳۔ A New English Dictionary on Historical Principles، جلد ۸

۴۔ Researcj amd Thesis Writing C.C. Almack، باب ۱، ص ۱۱

نشوونما کا مظہر ہے اور اس کا ماحصل ارتقا ہے۔[1] شکاگو یونیورسٹی کے ایک سابق چانسلر R. M. Hutchins نے صحیح کہا تھا کہ ایسی تحقیق کے لئے جس کا مقصد صرف مواد جمع کرنا ہے، یونیورسٹی میں کوئی جگہ نہیں ..... وہ تحقیق جو تجربی مواد جمع اور استعمال کرے اور جس کے ذریعہ اصولوں کا نشوونما، وسعت اور بہتری ہو، یونیورسٹی کی بہترین سرگرمیوں میں داخل ہے اور اس میں یونیورسٹی کے تمام اساتذہ کو مشغول رہنا چاہئے۔[2]

ان مختلف جامع تعریفوں کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ تحقیق کا مقصد (۱) نامعلوم حقائق کی تلاش اور (۲) معلوم حقائق کی توسیع یا ان کی خامیوں کی تصحیح ہے۔ ان دونوں کا نتیجہ حدود علم کی توسیع ہے اور حدود علم کی توسیع انسانی ترقی کا باعث ہے۔ اسی لئے کیلی کی رائے میں تحقیق سب سے مشکل کام ہے جسے سماج نے دوسری تمام سرگرمیوں سے ممیز کیا ہے اور جس میں صرف چند لوگ مشغول رہتے ہیں۔ وہ کسی نئے انکشاف کو جنگ میں مارے جانے یا مذہب کے لئے زندگی وقف کردینے پر ترجیح دیتے ہیں۔[3]

تحقیق کی خصوصیات:

کرافورڈ نے تعلیمی تحقیق کی مندرجہ ذیل نو خصوصیات بتائی ہیں۔ ان میں سے اکثر علمی وادبی تحقیق کے لئے بھی اہم اور ضروری ہیں۔

۱۔ اس کا مرکز کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔

۲۔ اس میں کوئی نئی بات کہی جاتی ہے۔

۳۔ اس کا دارومدار جستجو پسندوں اور دماغی رجحان پر ہے۔

۴۔ اس کے لئے کھلے دل ودماغ کی ضرورت ہے۔

۵۔ اس کا انحصار اس مفروضہ پر ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں تبدیلی ممکن ہے۔

۱۔ Scientific Method, T. L. Kelley، باب ۱، ص ۱

۲۔ F. L. Whitey کتاب مذکور، باب ۱، ص ۲ بحوالہ The Higher Learnig in America, R. M. Hutchins

۳۔ T. L. Kelly، کتاب مذکور، باب ۱، ص ۳

۶۔ اس کا مقصد قوانین کا انکشاف کرنا اور پھر انھیں عام بنانا ہے۔

۷۔ یہ سبب اور اثر کا مطالعہ ہے۔

۸۔ اس کی بنیاد پیمانہ پر ہے۔

۹۔ اس کے لئے ایک بیدار فنی طریقۂ کار لازمی ہے۔[1]

تحقیقی مقالہ میں کوئی علمی مسئلہ حل کیا جاتا ہے یا کوئی نئی بات کہی جاتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو بات کہی جائے وہ بنیادی طور پر نئی ہو۔ ایک بات پہلے کہی جا چکی ہے۔ اس میں جدید معلومات کا اضافہ بھی تحقیق ہے۔ جو بات پہلے کہی گئی ہے اگر اس میں غلطی یا غلطیاں ہیں تو ان کی تصحیح بھی تحقیق ہے۔ مسئلہ کے کسی نئے پہلو پر بحث کرنا یا روشنی ڈالنا بھی تحقیق ہے۔ کسی طے شدہ مسئلہ پر دوبارہ روشنی ڈالنا بھی تحقیق ہے۔ قدیم تحقیقات کو، وہ علم کی کسی شاخ سے تعلق رکھتی ہوں، نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ ترقی کا سرا اگر تلاش کیا جائے تو وہ ماضی کے دھندلکے میں ملے گا۔ Methods of Research کے مصنفین نے Boyd کے حوالے سے لکھا ہے کہ تھامس ایڈیسن نے یہ اصول بنایا تھا کہ پہلے یہ پتا لگاؤ کہ اس موضوع پر دوسروں نے کیا کام کیا ہے اور پھر وہاں سے شروع کرو جہاں دوسروں نے ختم کیا ہے۔[2] یہ اصول علمی و ادبی تحقیق کے لئے بھی یکساں اہم ہے۔ محقق کے منتخب کئے ہوئے موضوع پر جو کام ہو چکا ہے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ دوسروں کے کام کا جائزہ لینے کے بعد ہی موضوع کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے یا جیسا کہ آلمک نے کہا ہے، دوسروں کے کام کے جائزہ کے بعد ہی محقق اپنی تحقیق کی جدت کا اندازہ کر سکتا ہے۔[3] مشہور انگریزی شاعر بائرن نے تخلیقی کام کرنے والوں کے متعلق جو بات کہی تھی وہ تحقیقی کام کرنے والوں پر بھی صادق آتی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ جدت کے لئے یہ ضروری ہے کہ ادیب سوچے زیادہ اور پڑھے کم۔ لیکن یہ

۱۔ F. L. Whitney، کتاب مذکور، باب ۱، ص ۲۴، ۲۵، بحوالہ C.C. Crawford, The Technique of Research in Education

۲۔ Methods of Research, C.V. Good and D. E. Scates، باب ۲، ص ۴۲، Research, T. A. Boyad ص ۷۲

۳۔ J. C. Almack، کتاب مذکور، باب ۹، ص ۲۲۴

ناممکن ہے۔ سوچنے سے پہلے اس نے بہت کافی پڑھ لیا ہوگا۔[1]

جائزہ لینے کے علاوہ، نئے محقق کو ماہر محققین کی تصانیف کو نمونہ کے لئے بھی سامنے رکھنا چاہئے۔ اچھی تحقیق کا صحیح تصور پیدا کرنے کے لئے یہ بہترین طریقہ ہے۔ اگر ماہر محققین کے ذاتی تجربے اور تجویزیں، ان کا مضمون چاہے کچھ بھی رہا ہو، تحریری شکل میں مل سکیں تو ان سے بھی استفادہ کرنا چاہئے۔ یہ تجربے نئے محققین کے لئے چراغِ راہ کا کام دے سکتے ہیں۔ مثلاً فرانسس بیکن نے اپنی طبیعت کا تجزیہ اس طرح کیا تھا: مجھ میں جستجو کی خواہش تھی۔ میں شکوک پر تأمل کرتا تھا۔ مجھے غور وفکر سے دلچسپی تھی۔ میں اپنے نظریئے کو پیش کرنے میں عجلت نہیں کرتا تھا۔ میں دوسروں کی بات پر غور کرنے کے لئے آمادہ رہتا تھا اور اپنے خیالات کو پیش کرنے اور ترتیب دینے میں احتیاط برتتا تھا۔ یہ خصوصیات مجھے فطرت کی طرف سے عطیہ ملی تھیں۔[2] اسی طرح چارلز ڈارون کا یہ بیان کہ میری عادتوں کی باقاعدگی نے میرے مخصوص کام میں مجھے کم فائدہ نہیں پہنچایا۔[3] نوجوان محقق کے لئے سودمند ثابت ہوسکتا ہے۔

تحقیق میں جذبات یا قیاس آرائی کو دخل نہیں ہونا چاہئے اور نہ اسے حمایت یا مخالفت سے واسطہ رکھنا چاہئے۔ محقق کا نقطۂ نگاہ اور طریقۂ کار سائنسی ہونا چاہئے۔ سائنسی نقطۂ گاہ وہ نقطۂ گاہ ہے جو مشتبہ حقائق سے لطف اٹھا سکے۔ سائنسی طریقۂ کار کے ذریعہ آدمی شک کو واضح تلاش کے عمل میں تبدیل کر کے بارآور فائدہ اٹھاتا ہے۔ جس آدمی کو غور وفکر سے عشق نہیں وہ ذہنی طور پر ترقی نہیں کرسکتا اور جسے مسائل سے دلچسپی نہیں اسے 'غور وفکر سے عشق' نہیں ہوتا۔ مسائل سے دلچسپی ذہنی تجسس کا باعث ہوتی ہے اور ذہنی تجسس آدمی کو جلد بازی سے باز رکھتا ہے اور نئے حقائق کے لئے سرگرم تلاش (تحقیق) کی ترغیب دلاتا ہے۔[4] سائنسی طریقۂ کار صرف سائنس کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ سائنس ایک لاطینی لفظ ہے جس کے معنی ہیں جاننا۔

---

[1] C.V.Good and D. E. Scartes۔ کتاب مذکور، باب ۲، ص ۵۲

[2] Francis Bacon, C. D. Bowen۔ تعارف، ص ۸

[3] Life and Letters of Charles Darwin, Francis Darwin۔ جلد ۱، باب ۲، ص ۱۰۶

[4] John Dewey۔ کتاب مذکور، باب ۹۱، ص ۲۱۷، ۲۱۸

اس لئے علم وفن کی ہر شاخ سائنس کہی جاسکتی ہے۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں سائنس اور علم ہم معنی الفاظ تھے۔ بقول پیرسن سائنس کا میدان بے کنار ہے ۔ اس کے مواد کی حد نہیں۔ مظاہرِ فطرت کی ہر شاخ، معاشرتی زندگی کا ہر پہلو، قدیم وجدید ترقیوں کی ہر منزل سائنس کے حدود میں آتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ حقائق کو سائنس نہیں کہتے بلکہ ان حقائق کو برتنے کا طریقہ سائنس ہے۔[1] حقائق میں انسان کی علمی ترقی کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ کل کے بہت سے حقائق آج غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ انسان کی علمی ترقی آج کے بہت سے حقائق کو بھی غلط ثابت کرسکتی ہے۔ اس لئے اہمیت طریقۂ کار ہی کی ہے۔ سائنس پوری کائنات کو اپنے احاطہ میں لینے کی دعویدار ہے اور اس بات کی مدعی ہے کہ سائنسی طریقۂ کار علم وفن کی اقلیم تک پہنچنے کا تنہا راستہ ہے[2]۔ اسی لئے پیرسن کا مشورہ ہے کہ سائنسی طریقۂ کار کی عادت ہر شخص کو ڈالنا چاہئے۔ ان کی رائے میں یہ طریقہ اچھی شہریت کے لئے لازمی ہے[3]۔ یہ طریقہ اختیار کرنے سے کام نہ صرف منظم ومرتب ہوگا بلکہ جو نتیجہ اخذ کیا جائے گا وہ محقق کے ذاتی رجحان یا روایتی اثر سے آزاد ہوگا۔ اس کی ابتدا ہی صحیح نتیجہ حاصل کرنے کے عزم سے ہوئی ہے۔ اس لئے جہاں تحقیق ہے وہاں سائنس ہے اور جہاں مظاہرِ فطرت ہیں وہاں تحقیق ہے۔[4]

تحقیق میں قیاس آرائی کو تو دخل نہیں لیکن تخیل کی کارفرمائی ضروری ہے۔ تخیل محقق کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا شاعر کے لئے۔ اسی کی مدد سے وہ نئی نئی باتیں سوچ سکتا ہے۔ یہاں تک کہ مستقبل کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ لیکن یہ تخیل منظم ہونا چاہئے۔ یہی منظم تخیل ہے جو تمام عظیم سائنسی اکتشافات میں کام کرتا ہے۔ جس شخص کے پاس تخیل نہیں وہ حقائق کو جمع تو کرسکتا ہے لیکن اکتشافات نہیں کرسکتا۔[5] یہ غلط طور پر مشہور ہوگیا ہے کہ اکتشافات اتفاقی ہوتے ہیں۔ ہزاروں میں ایک اکتشاف اس طرح ہوا ہوگا ورنہ عموماً وہ اتفاقی نہیں ہوتے۔

---

[1] The Grammer of Science, Karl Pearson-، تعارف، ص ۱۶

[2] ایضاً، ص ۲۶

[3] ایضاً، ص ۱۲

[4] C.V. Good and D. E. Scates-، کتاب مذکور، باب ۱، ص ۱۲

[5] Karl Pearson-، کتاب مذکور، تعارف، ص ۳۱

اکتشاف محقق کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

وہٹنی کی رائے ہے کہ مفکرانہ خیالات، سائنس اور تحقیق میں بڑی یکسانیت ہے۔[1] کرافورڈ تحقیق کو غور وفکر کا منظم ومرتب اور پاکیزہ طریقہ بتاتے ہیں۔[2] خیالات میں تسلسل اور نظم وترتیب حقیقت میں مفکرانہ خیالات ہی کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ مفکرانہ خیالات سے مراد کسی عقیدہ یا علم کی کسی شاخ سے متعلق وہ سرگرم، مسلسل اور محتاط غور وفکر ہے جو ان اسباب کی روشنی میں جو اس کی تائید کرتی ہیں اور ان نتائج کی روشنی میں جن کی طرف وہ مائل ہو، کی جائے۔[3] مفکرانہ خیالات غور وفکر کے دوسرے طرزِ عمل کے برخلاف دو باتوں پر مشتمل ہیں۔

(۱) شک، تذبذب اور دماغی الجھن کی حالت جس میں غور وفکر پیدا ہوتی ہے۔

(۲) ایسے مواد کی تلاش وجستجو اور چھان بین جو شک کو رفع اور تحیّر کو دور کرے۔[4]

تحقیق نہ صرف شک کو رفع اور تحیر کو دور کرتی ہے بلکہ آدمی کے لئے نئی نئی راہیں کھولتی ہے۔ وہ مسائل کو حل کرتی اور گتھیوں کو سلجھاتی ہے۔ وہ خامیوں کو دور کرتی اور خوب کو خوب تر بناتی ہے۔ وہ آئین نو کی قدر سکھاتی ہے وہ انسان کے مقاصد کی تکمیل میں معین ثابت ہوتی ہے۔ Method of Reasearch کے مصنفین کو اس پر اس قدر اعتماد ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جب تک تحقیق کا وجود ہے مغربی تہذیب کو زوال نہیں آسکتا۔[5] انہوں نے صحیح کہا ہے کہ مختلف شعبوں میں تحقیق کی بنا پر ہم اپنے خیالات کو وسعت دے سکتے ہیں، یہاں تک کہ عہد رفتہ کا نقشہ ہماری نگاہوں کے سامنے آسکتا ہے۔ اسی کی بدولت ہم دنیا کی گوناگوں تہذیبوں کو اپنا سکتے ہیں۔ غیر مرئی چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں، فضائے بسیط کے اسرار کا انکشاف کر سکتے ہیں۔ اس طرح تحقیق آدمی کو پوری کائنات سے رشتہ جوڑنے میں مدد دیتی ہے۔[6]

---

[1] F. L. Whitney، کتاب مذکور، باب ۱، ص ۲۷

[2] ایضاً، ص ۲۱

[3] How We Think, John Dewey، باب ۱، ص ۹

[4] John Dewey کتاب، مذکور، باب ۱، ص ۱۲

[5] C. V. Good and D. E. Scates، کتاب مذکور، باب ۱، ص ۱۸

[6] C. V. Good and D. E. Scates، کتاب مذکور، باب ۱، ص ۱۸

موجودہ دور کی بہت سی ذہنی و مادی ترقیوں کا سبب یہی تحقیق ہے۔ ریل اور جہاز کی تیز رفتاری نے سفر اور رسل و رسائل میں آسانیاں پیدا کردی ہیں۔ انجینئرنگ کے کارناموں نے اولادِ آدم کو مبہوت کر رکھا ہے۔ بجلی کی روشنی سے تاریک دیہات جگمگانے لگے ہیں۔ ریڈیو اور ٹرانزسٹر نے ایک ملک کو دوسرے ملک سے بہت قریب کردیا ہے۔ ریگ راز سرسبز و شاداب میدانوں میں تبدل ہورہے ہیں۔ بنجر زمین لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں بدل رہی ہیں۔ بہت سے خطرناک امراض کا تقریباً خاتمہ ہوچکا ہے یا ان کا کامیاب علاج تلاش کیا جاچکا ہے۔ غرض علوم وفنون کی ترقی، تعلیم وتربیت کے ماہرانہ طریقے، زندگی کی راحت کے سامان کی فراوانی، انسانی دکھوں کا علاج اور مشکلات کا حل تحقیق ہی کی بدولت ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ تحقیق کا مقصد انسانیت کی خدمت ہے۔

محقق کی خصوصیات:

محقق کا مطالعہ بہت وسیع ہونا چاہئے۔ اپنے مخصوص مضمون کے علاوہ اسے متعلق مضامین کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے۔ مثلاً اردو کے محقق کو فارسی لازمی طور پر جاننے کی ضرورت ہے۔ عربی جاننا بھی اس کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ قدیم اردو سے متعلق اودھی، برج، ہریانی وغیرہ سے واقفیت کے بغیر تحقیق ناقص ہوگی۔ ادب کے محقق کے لئے عہدِ متعلقہ کے تاریخی، معاشی و معاشرتی حالات کا علم بھی ضروری ہے۔ اسے عروض، مبادیاتِ فلسفہ وتصوف وغیرہ سے بھی واقف ہونا چاہئے۔ اسی طرح تاریخ کے محقق کو جغرافیائی علوم، معاشیات اور سماجی علوم کا مطالعہ لازماً کرنا ہوگا۔ متعلقہ علوم یا مضامین کے مطالعہ کے لئے اس وسعت یا گہرائی کی ضرورت نہیں جو اصلی مضمون یا موضوع کے لئے ضروری ہے۔ وسیع مطالعہ کے ساتھ ساتھ گہری نظر، تنقیدی شعور اور دیانت کی بھی ضرورت ہے۔ واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا یا حقائق پر پردہ ڈالنا تحقیقی دیانت کے خلاف ہے۔ بے تعصب یا بے لوث ہونے کے لئے دو باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ مصنف تہذیبی حیثیت سے بہت بلند مرتبہ کا حامل ہو اور اپنے متوقع کتاب خوانوں کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ دوسری بات یہ کہ اس کی قوت ارادی اسے

بےلوث ہونے پر مجبور کرے۔[1]

تحقیق کے لئے ذاتی دلچسپی ضروری ہے۔ ذاتی دلچسپی کے بغیر اعلا درجہ کی تحقیق نہیں ہوسکتی۔ تحقیق کا مادی معاوضہ کچھ نہیں ہے۔ اس کا بہترین معاوضہ وہ مسرت ہے جو محقق کو اپنی کامیابی پر ہوتی ہے۔ گلیلیو طب کا پروفیسر تھا، لیکن ریاضی اور علوم طبعی سے دلچسپی کی بنا پر اس نے طب کی معقول مشاہرہ کی پروفیسری چھوڑ دی۔ ہرشیل موسیقار تھا، لیکن اسے علم نجوم سے دلچسپی ہوئی اور دوربین بنانے کا شوق ہوا اس لئے وہ موسیقی کو ترک کر کے تحقیق کی طرف مائل ہوا جس کا نتیجہ یورانس سیارہ کی دریافت اور بڑے سائز کی دوربین کی ایجاد تھی۔ اِڈورڈ براؤن کو فارسی ادب سے لگاؤ پیدا ہوا تو انھوں نے طب کو خیر باد کہا اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ فارسی ادب کی تحقیق میں گذارا اور اس میں وہ کمال حاصل ہوا کہ ایران کے علمائے ادب نے انکی استادی کو تسلیم کیا۔ (مولانا) شبلی نے وکالت کا نفع بخش پیشہ چھوڑ کر علم وادب کی تحقیق کو اپنایا۔ ان کا شوق تحقیق انھیں مصر وشام وترکی تک لے گیا۔ (مولانا) سید سلیمان ندوی نے کالج کی آرام دہ اور معقول تنخواہ کی ملازمت ترک کر کے ساری عمر دارالمصنفین کی علمی خانقاہ میں ایک معمولی مشاہرہ پر گذاردی۔ جسٹس سر شاہ سلیمان دن بھر عدالت میں قانونی گتھیاں سلجھایا کرتے تھے، لیکن گھر پر فرصت کے لمحات میں ریاضی کے مسائل حل کیا کرتے تھے۔ ایران کے موجودہ دور کے ایک نامور محقق آقای سعید نفیسی نے طبابت کو تحقیقِ ادب پر قربان کر دیا تھا۔

تحقیق کے لئے شوق اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ سخت محنت کی بھی ضرورت ہے۔ مواد کی گردآوری میں نہ صرف کتابوں، مخطوطوں وغیرہ کے اوراق الٹنا ہوتے ہیں بلکہ ہر قسم کی راحت کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحقیق میں صبر آزما محنت کی ضرورت ہے۔ مشہور جرمن مؤرخ رینکے (Ranke) اکیانوے برس کی عمر تک کام کرتا رہا۔ اس کے دو نوجوان مددگار جو باری باری سے اس کے ساتھ رہتے تھے، اس کے ساتھ کام کرتے کرتے تھک جاتے تھے۔[2] کیونڈش کی محنت وانہماک کی یہ حالت تھی کہ اس کا دوپہر کا کھانا ایک سوراخ کے ذریعہ اس کے

---

[1] T. L. Kettey۔، کتاب مذکور، باب ۱، ص ۱۶

[2] C. V. Good and D. E. Scates۔، کتاب مذکور، باب ۲، ص ۵۷

کمرے میں رکھ دیا جاتا تھا تا کہ اس کے کام میں خلل نہ پڑے۔[1] سرسید احمد خاں نے دہلی کی عمارتوں کی تاریخ لکھنے کے سلسلے میں جو محنت و جاں فشانی کی تھی اس کا اندازہ (مولانا) حالی کے مندرجہ ذیل بیان سے لگایا جا سکتا ہے:

> ..... ''سرسید کہتے تھے کہ قطب صاحب کی لاٹھ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب نہ پڑھے جا سکتے تھے۔ ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبہ کے محاذی بندھوا دیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر کتبے کا چرب اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔''[2]

حافظ محمود خاں شیرانی کی جفاکشی اور ساتھ ہی سادگی کا اندازہ ان کے ایک ممتاز ہم عصر شیخ عبدالقادر کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ۔ شیخ صاحب شیرانی صاحب سے ملنے ان کے مکان پر گئے۔

> ''گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کے بعد کا وقت..... وہ ایک ہلکا سا بنیان پہنے ہوئے تھے اور کمر کے گرد صرف ایک چھوٹا سا تہ بند باندھے بیٹھے تھے۔ پنکھا نہ دستی نہ بجلی کا۔ نہ گرمی سے بچنے کی فکر نہ پروا۔ کتابیں اور وہ۔ گرد و پیش فرامین اور سکے۔ یہ پروفیسر محنت کے لحاظ سے مغربی پروفیسروں سے زیادہ (جفاکش) اور آسائش اور ماندو بود میں میں کسی غریب مسجد کے ملا سے زیادہ سادہ تھا۔''[3]

تحقیق میں وقت کا سوال بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ نوجوان محقق چاہتا ہے کہ اس کا مقالہ جلد سے جلد مکمل ہو جائے اور وہ اپنے کاروبار میں لگ جائے۔ لیکن تحقیق کا تقاضا اس کے

---

[1] ۔ ایضاً، ص ۵۶

[2] ۔ خواجہ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، پہلا حصہ، دوسرا باب، ص ۴۸

[3] ۔ شیخ عبدالقادر، ''حافظ محمود شیرانی مرحوم''، اورینٹل کالج میگزین، جلد ۲۳، عدد ۲، ص ۷

برعکس ہے۔ عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب۔ تحقیق کے لئے طویل وقت کی ضرورت ہے۔ سائنسی تحقیق کو جانے دیجئے کہ اس میں تجربے اکثر رکاوٹیں ڈال دیتے ہیں۔ تاریخی، معاشرتی، ادبی تحقیق وغیرہ کی تکمیل میں بھی مدتیں گذر جاتی ہیں۔ صرف دو مثالیں کافی ہوں گی۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے حضرت عمرؓ کے خطوط، خطبات اور حکیمانہ اقوال کو جمع کرنا شروع کیا۔ گذشتہ ۴۰-۴۵ برس میں انھوں نے اس کام کی تکمیل کے لئے خدا معلوم کیا کیا اور کہاں کہاں سے مواد جمع کیا ہے۔ یہ کام جوانھوں نے اپنی جوانی میں اور اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز میں شروع کیا تھا، آج تک مکمل نہیں ہوا، حالانکہ سینکڑوں صفحات کا مسودہ لکھا پڑا ہے۔[1] انگلستان کی ایک خاتون ہیلن ڈربی شائر نے تیس سال صرف کر کے ملٹن کی Paradise Lost کا ایک مستند اڈیشن تیار کیا جسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے۔

لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ تحقیق کو لازمی طور پر طول دیا جائے۔ اس قسم کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک اہم موضوع پر مختصر سی مدت میں تحقیق مکمل ہوگئی۔ مثلاً اپنی تمام مشکلوں اور رکاوٹوں کے باوجود ''آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر اندر چھپ کر تیار ہوگیا۔''[2]

آیووا (Iowa) کی ریاستی یونیورسٹی نے ۱۹۲۲ء میں محقق طلبہ کی صلاحیتوں کو جانچنے کے لئے ایک کارڈ بنایا تھا۔ اس میں دس شرطیں رکھی تھیں اور ہر شرط کے لئے نمبر مقرر کئے تھے۔ یہ شرطیں حقیقتاً سائنسی مضامین میں تحقیق کے لئے ہیں۔ لیکن غیر سائنسی مضامین میں تحقیق کرنے والے طلبہ کا بھی ان شرطوں پر پورا اترنا یکساں ضروری ہے۔ نیچے ان شرطوں کو نقل کیا جاتا ہے۔

۱۔ قوتِ استدلال: مسائل کو استخراجی اور استقرائی دونوں طریقوں سے حل کرنے کی صلاحیت

۲۔ جدت: قوتِ اختراع، ذکاوت، منظم اقدام اور معقول اذکار کی زرخیزی

---

[1] ۔ مالک رام و مختار الدین احمد (مرتبہ) ''ذکر عرشی''، نذر عرشی، ص ۱۸

[2] ۔ خواجہ الطاف حسین حالی، کتاب مذکور، پہلا حصہ، دوسرا باب، ص ۴۸

۳۔ حافظہ: حقائق کا وسیع، منطقی، کارآمد اور فوری اظہار
۴۔ چستی: تیز اور اثر پذیر مشاہدہ، فکر اور احساس
۵۔ صحت: جچا تلا، نیز، متناسب اور قابل اعتماد مشاہدہ فکر اور احساس
۶۔ کاوش: قوتِ ارتکاز، مسلسل توجہ، استقلال اور بااصول کوشش
۷۔ اشتراک: ذہنی رفاقت اور مل کر کام کرنے اور رہ نمائی کی صلاحیت
۸۔ اخلاقی رجحان: ذہنی دیانت، صحت بخش اخلاقی معیار، مطمحِ نظر اور اثرات
۹۔ تندرستی: عضلاتی استحکام، جسمانی ساخت، قوتِ حیات اور قوتِ برداشت
۱۰۔ تحقیق کے لئے شوق اور سرگرمی: طبع زاد اور تخلیقی کام سے گہری دلچسپی اور اس کی خواہش۔[1]

ان شرطوں میں علمی و ادبی تحقیق کے نقطۂ نگاہ سے مندرجۂ ذیل شرطیں نسبتۂ زیادہ اہم ہیں:
قوتِ استدلال، جدت، حافظہ، اخلاقی رجحان، تحقیق کے لئے شوق اور سرگرمی

وقت کی تقسیم:

ریسرچ اینڈ رپورٹ رائٹنگ (Research and Report Writing) کے مصنفین نے پی ایچ ڈی کے طلبہ کے لئے ایک مفید اور عملی ہدایت دی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تحقیق کے مختلف پہلوؤں یا منزلوں کو اپنے محدود وقت میں تقسیم کر دینا چاہئے۔ ان کی رائے میں دو تہائی حصہ کو مواد کی تلاش اور فراہمی کے لئے اور ایک تہائی کو مقالہ لکھنے کے لئے مخصوص کرنا چاہئے۔ اس کی مفصل تقسیم انھوں نے اس طرح کی ہے:

مواد کی تلاش:

۱۔ موضوع کا انتخاب ۲۔ پس منظری مطالعہ ۳۔ عارضی فہرست مآخذ تیار کرنا
۴۔ عارضی خاکہ ۵۔ پڑھنا اور نوٹ لینا ۶۔ نوٹوں کو ترتیب دینا

---

[1] ۔ P. L. Whitney، کتاب مذکور، باب ۱، ص ۴۷

ب - مقالہ لکھنا:

۱-جمع کئے ہوئے مواد کا تنقیدی جائزہ ۲-آخری خاکہ تیار کرنا

۳-پہلا مسودہ ۴-نظر ثانی ۵-آخری فہرست مآخذ تیار کرنا

۶-آخری مسودہ[1]

تحقیق کی قسمیں

انسان کی زندگی میں تنوع ہے اس لئے اس کے مسائل میں بھی تنوع ہے، مثلاً علمی مسائل، معاشرتی مسائل، تعلیمی مسائل وغیرہ۔ چوں کہ مسائل میں تنوع ہے اسلئے موضوعات کی تحقیق میں بھی تنوع ہے، یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں تحقیق ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے۔ عموماً اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) علمی تحقیق (۲) عملی تحقیق۔

علمی تحقیق میں سارے علوم وفنون شامل ہیں۔ عملی تحقیق کو حرفیاتی (ٹکنالاجیکل) تحقیق بھی کہتے ہیں۔ آیندہ صفحات میں صرف علمی تحقیق اور خصوصاً اردو ادب کی تحقیق کے نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی جائے گی۔

☆☆☆

---

[1] Research and Report Writing, Eilliot Gartner and Francesco Cordaosco، چاپ ہشتم، باب ۱، ص ۵، ۶

باب -۲

لائبریری کا استعمال

سیمیول جانسن کا مشہور قول ہے کہ ایک کتاب کی تصنیف کے لئے مصنف آدھی لائبریری چھان مارتا ہے۔ لائبریری کا استعمال اور اس کی اہمیت و افادیت جانسن کے زمانہ سے موجودہ دور میں بہت بڑھ گئی ہے۔کوئی محقق، نوجوان ہو یا تجربہ کار، اس کا موضوع خواہ کسی مضمون سے تعلق رکھتا ہو، لائبریری سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ مواد کی فراہمی کے لئے اسے یہیں آنا پڑے گا۔ لائبریرین اور لائبریری کے عملہ کے دوسرے افراد عموماً محقق کے ساتھ شوق اور دلچسپی سے تعاون کرتے ہیں۔ لیکن ان کو بار بار تکلیف دینا مناسب نہیں۔ اس میں محقق کا وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ وہ لائبریری کے طریق کار سے خود واقف ہو اور صرف غیر معمولی حالات میں لائبریرین یا کسی دوسرے سے مدد لے۔

ہر بڑی لائبریری میں دو طرح کی کتابیں ہوتی ہیں: (۱) حوالہ کی کتابیں، (۲) عام مطالعہ کی کتابیں۔

حوالہ کی کتابیں عموماً کھلی الماریوں میں رکھی ہوتی ہیں تاکہ ہر اسکالر جب چاہے اور

جتنی بار چاہے انھیں آسانی سے دیکھ سکے۔ یہ کتابیں لائبریری سے باہر نہیں جاسکتیں۔

حوالہ کی کتابوں میں انسائیکلو پیڈیا، ڈسٹرکٹ گزیٹیر، لغات، لائبریریوں کے مطبوعہ کٹیلاگ وغیرہ ہوتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا نوجوان محقق کے لئے خصوصاً مفید ہے۔ اس کے ہر مضمون کے آخر میں مآخذ کی ایک منتخب فہرست ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ آسانی سے قدم آگے بڑھا سکتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا زیادہ تر انگریزی میں ہیں، لیکن اردو کے انگریزی داں محققین بھی ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور اٹھاتے ہیں۔ اردو میں 'دائرۂ معارف اسلامیہ' کے نام سے پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام لاہور (پاکستان) میں ایک جامع انسائیکلو پیڈیا چھپ رہی ہے۔ اسکے چند اجزا شائع ہو چکے ہیں۔

عام مطالعہ کی کتابیں کلرک کے توسط سے منگائی جاتی ہیں اور انھی کو منگانے کے لئے لائبریری کے طریقِ کار سے واقفیت ضروری ہے۔

ڈیوی ڈیسیمل سسٹم:

موجودہ دور میں بڑی اور اچھی لائبریریوں میں عموماً ڈیوی ڈیسیمل سسٹم کا چلن ہے۔ یہ طریقہ میلول ڈیوی (Melvil Dewey) کا ایجاد کیا ہوا ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں کتابوں کی ترتیب کے لئے ڈیسیمل (اعشاریہ) استعمال کیا جاتا ہے۔ کتاب کا نام اور ضروری تفصیلات ایک کارڈ پر ہوتی ہیں۔ ہر کتاب کے لئے تین کارڈ ہوتے ہیں: پہلا مصنف کے نام کا کارڈ، دوسرا کتاب کے نام کا اور تیسرا موضوع کا۔ انجمن، سوسائٹی، کمیٹی وغیرہ کا نام مصنف کے طور پر استعمال ہوتا ہے، بشرطیکہ روئیداد یا رسالہ پر مرتب کا نام نہ ہو۔ مآخذ کی عارضی فہرست تیار کرتے وقت چوں کہ نوجوان محقق اپنے موضوع سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتا اس لئے تیسرا کارڈ اس کی رہنمائی کرسکتا ہے۔ موضوع کے کارڈ دیکھ کر وہ پتا لگا سکتا ہے کہ اس کے کام کی کون کون سی کتابیں لائبریری میں موجود ہیں۔ نیچے تینوں کارڈوں کے نمونے دئے جاتے ہیں:

۹۵۴
اح م　　سید احمد خاں
آثار الصنادید، مطبوعہ مطبع نول کشور، لکھنو ۱۸۷۶ء
صفحات: ۹۸+ ۲۳ + ۳۲ + ۱۳۲
۲۴۰۶

۹۵۴
اح م　　آثار الصنادید
سید احمد خاں
۱۸۷۶ء

۹۵۴/ اح م
سید احمد خاں

پہلے اور دوسرے کارڈوں میں دائیں طرف (انگریزی میں بائیں طرف) کٹیلاگ کا نشان ہے۔ یہ نشان بتاتا ہے کہ کتاب کس جگہ ہے۔ کتاب منگاتے وقت سلپ پر یہ نشان لکھنا ضروری ہے۔ اسے انگریزی میں Call Number کہتے ہیں۔ پہلے کارڈ میں نیچے بائیں طرف داخلہ نمبر ہے جسے انگریزی میں Accession Number کہتے ہیں۔

مصنف وار کارڈ ہمیشہ اسی ترتیب سے رکھے جاتے ہیں:

ا۔ مکمل مجموعہ تاریخی ترتیب سے

۲۔مکمل مجموعہ کے انتخابات

۳۔الگ الگ تالیفات حروف تہجی یا ابجد کے لحاظ سے

۴۔الگ الگ تالیفات کسی اور مصنف کی شرکت کے ساتھ

۵۔ترجمے یا مرتبہ کتابیں

مصنف کی تصنیفات و تالیفات کے بعد اس پر جو تصنیفات و تالیفات ہوتی ہیں ان کے کارڈ ہوتے ہیں۔

ڈیوی ڈیسیمیل طریقہ میں تمام مضامین کو دس حصوں میں اور پھر ہر حصہ کو دس ذیلی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔مختلف مضامین کی تقسیم حسب ذیل ہیں:

۰۹۹	۰۰۰	متفرقات
۱۹۹	۱۰۰	فلسفہ
۲۹۹	۲۰۰	مذہب
۳۹۹	۳۰۰	سماجی علوم
۴۹۹	۴۰۰	لسانیات
۵۹۹	۵۰۰	طبیعات
۶۹۹	۶۰۰	مفید فنون
۷۹۹	۷۰۰	فنونِ لطیفہ
۸۹۹	۸۰۰	ادب
۹۹۹	۹۰۰	تاریخ،سفرنامہ،سوانح عمری

ادبی تحقیق کے لئے جس زمرہ کی ضرورت ہے وہ ۸۹۹ - ۸۰۰ ہے۔اس زمرہ کو مندرجہ ذیل مزید دس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۸۰۹	۸۰۰	متفرقات
۸۱۹	۸۱۰	امریکی ادب
۸۲۹	۸۲۰	انگریزی ادب

۸۳۹ — ۸۳۰		جرمن ادب
۸۴۹ — ۸۴۰		فرانسیسی ادب
۸۵۹ — ۸۵۰		اطالوی ادب
۸۶۹ — ۸۶۰		ہسپانوی ادب
۸۷۹ — ۸۷۰		لاطینی ادب
۸۸۹ — ۸۸۰		یونانی ادب
۸۹۹ — ۸۹۰		دوسری زبانوں کے ادب

ڈیوی ڈیسیمل سسٹم امریکا کی ایجاد ہے اس لئے اس میں صرف امریکا اور یورپ کی زبانوں کو جگہ دی گئی ہے۔ لیکن چوں کہ یہ طریقہ ساری دنیا کے فائدہ اور سہولت کی خاطر ایجاد کیا گیا تھا اس لئے آخری نمبر (دوسری زبانوں کے ادب) اس طرح رکھا گیا کہ ایشیا اور افریقا کی مختلف زبانیں بھی اسے کام میں لا سکتی اور اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ اس آخری نمبر کو مزید دس حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے:

۸۹۰	دوسری زبانوں کے ادب
۸۹۱	انڈو آریائی ادب
۸۹۲	سامی ادب
۸۹۳	حامی ادب
۸۹۴	سیتھی و تورانی ادب
۸۹۵	ایشیائی زبانوں کے ادب
۸۹۶	افریقی زبانوں کے ادب
۸۹۷	شمالی امریکا کا ادب
۸۹۸	جنوبی امریکا کا ادب
۸۹۹	ملائی، پولی نیشیائی اور دوسری زبانوں کے ادب

اردو ادب کے لئے دوسرا نمبر (۸۹۱) استعمال ہوتا ہے۔ اس نمبر کی اعشاریہ کی مدد سے

حسب ذیل مزید توسیع کی گئی ہے:

۸۹۱ء۴۳۱	شعروشاعری
۸۹۱ء۴۳۲	ڈراما
۸۹۱ء۴۳۳	افسانے اور ناول
۸۹۱ء۴۳۴	مضامین
۸۹۱ء۴۳۵	خطابت
۸۹۱ء۴۳۶	خطوط
۸۹۱ء۴۳۷	ہجو وظرافت
۸۹۱ء۴۳۸	متفرقات

رسالوں سے استفادہ:

مواد کی تلاش اور گرد آوری کے سلسلہ میں مخطوطوں اور کتابوں کے علاوہ معیاری رسالوں کی جلدوں سے بھی استفادہ کرنا ہوگا۔ لیکن ہندوستان کی لائبریریوں میں ابھی رسالوں کے مضامین کے اشاریہ کارڈ بنانے کا رواج بہت کم ہے، اس لئے پورے رسالہ کی ورق گردانی ضروری ہے۔[1] یہ کام دِقت طلب ضرور ہے مگر رسائل سے استفادہ ناگزیر ہے۔ رسائل کے مضامین چوں کہ موضوع کے ایک ہی پہلو سے بحث کرتے ہیں اس لئے ان میں کتاب سے زیادہ تفصیل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان مضامین میں تازہ بہ تازہ تحقیق اور رائیں ہوتی ہیں[2]

لائبریریوں کے مطبوعہ کٹیلاگوں سے استفادہ:

مواد کی فراہمی اور محقق کی رہ نمائی میں لائبریریوں کے مطبوعہ مفصل کٹیلاگ بھی مفید

---

[1]: اردو (کراچی) اورینٹل کالج میگزین (لاہور)، نوائے ادب (بمبئی)، برہان (دہلی) اور معارف (اعظم گڑھ) کے مضامین کی فہرستیں مرتب ہوکر شائع ہوچکی ہیں۔ پہلے تین رسالوں کی فہرستیں خود ان رسالوں میں شائع ہوئی ہیں اور آخرالذکر دو کی برہان (دہلی) میں چھپی ہیں۔

[2]: A Research Manual, C. B. Williams and A. H. Stevenson، ترمیم شدہ اڈیشن، باب ۳، ص ۳۵

ثابت ہوتے ہیں۔ان کٹیلاگوں سے محقق کو نہ صرف یہ کہ اس کے موضوع سے متعلق کتابوں کا پتا چلتا ہے بلکہ اور بھی کارآمد اشارے ملتے ہیں۔مثلاً مخطوطہ کے مصنف کے حالات اور اس کی دوسری تصانیف کا اسے علم ہوتا ہے۔مخطوطہ کے اور نسخے کہاں کہاں ہیں،اس کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔بعض اوقات مخطوطہ کے تمام ابواب نقل کردئے جاتے ہیں۔اس صورت میں محقق کو کتاب کی اہمیت وافادیت کا فوراً اندازہ ہوجاتا ہے۔لیکن ہندوستان و پاکستان کی بڑی اور اچھی لائبریروں میں سے کم لائبریریوں کے کٹیلاگ ابھی چھپے ہیں۔جن ملکی و بیرونی لائبریریوں کی کتابوں کے کٹیلاگ اب تک چھپ چکے ہیں ان میں سے بعض کے نام نیچے دئے جاتے ہیں:

۱۔ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانۂ آصفیہ) حیدرآباد
۲۔ انڈیا آفس لائبریری (لندن)
۳۔ برٹش میوزیم (لندن)
۴۔ بمبئی یونیورسٹی لائبریری (بمبئی)
۵۔ بوڈلین لائبریری (آکسفورڈ)
۶۔ رضالائبریری (رام پور) جلداول
۷۔ کتب خانۂ ادارۂ ادبیات اردو (حیدراباد)
۸۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، پاکستان (کراچی) جلداول
۹۔ کتب خانۂ سالار جنگ (حیدرآباد)
۱۰۔ کتب خانۂ مسجد جامع، بمبئی (بمبئی)
۱۱۔ صولت لائبریری (رامپور)

کتب خانۂ انجمن ترقیٔ اردو، پاکستان (کراچی) کے مخطوطات کے کٹیلاگ کی دوسری اور تیسری جلد زیر طبع ہیں۔رضالائبریری (رام پور) کے مخطوطات کے کٹیلاگ کی بھی دوسری جلدیں چھپ رہی ہیں

ہندوستان کی بعض اہم لائبریریاں:

جہاں تک ہندوستان کی لائبریریوں کا تعلق ہے اردو کے محققین کے لئے مندرجۂ ذیل لائبریریاں خصوصاً مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔

۱۔ آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ)

۲۔ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانۂ آصفیہ)۔حیدرآباد

۳۔ اورینٹل پبلک لائبریری، بانکی پور (پٹنہ)

۴۔ پیر محمد لائبریری (احمد آباد)

۵۔ رضا لائبریری (رام پور)

۶۔ صولت لائبریری (رام پور)

۷۔ کتب خانۂ ادارۂ ادبیات اردو (حیدرآباد)

۸۔ کتب خانہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (بمبئی)

۹۔ کتب خانۂ انجمن ترقیٔ اردو (علی گڑھ)

۱۰۔ کتب خانۂ دارالمصنفین (اعظم گڑھ)

۱۱۔ کتب خانۂ سالار جنگ (حیدرآباد)

۱۲۔ نیشنل لائبریری (کلکتہ)

بعض بڑے شہروں میں رکارڈ آفس (Record Office)، آرکایوز (Archives)، میوزیم (Museum) وغیرہ کے ذخیروں سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ ذخیرے تاریخ اور فنونِ لطیفہ کے موضوعات پر تحقیق کے سلسلہ میں خصوصاً اہمیت رکھتے ہیں۔

بعض بڑی لائبریریوں میں بہت سی اہم کتابوں کی مائیکرو فلم یا روٹو گراف رہتے ہیں۔ان سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

باب - ۳

آغاز کار

موضوع کا انتخاب:

تحقیق میں پہلا اور نہایت اہم قدم موضوع کا انتخاب ہے۔ اس سلسلہ میں ماہرین تحقیق کی رائے ہے کہ نوجوان محقق موضوع کا انتخاب خود کرے تو بہتر ہے۔ یہ موضوع ایسا ہو جس سے اسے پہلے سے دلچسپی ہو اور وہ اس سے متعلق تھوڑا بہت پڑھ چکا ہو۔ بعض اوقات پی ایچ ڈی کے طلبہ موضوع کا انتخاب خود نہیں کرتے بلکہ اپنے رہنما یا کسی اور فاضل شخص سے کراتے ہیں۔ چوں کہ موضوع کے انتخاب میں ان کی ذاتی دلچسپی کو دخل نہیں ہوتا اسلئے وہ کچھ دور چل کر بھٹک جاتے ہیں اور منزل مقصود تک پہنچ نہیں پاتے یا گرتے پڑتے پہنچتے ہیں۔ اس طریقۂ کار میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی رہنما یا دوسرا فاضل شخص موضوع کا انتخاب اپنے نقطۂ نگاہ کے علاوہ اپنی سطح علمی سے کرتا ہے۔ اگر اتفاق سے دونوں باتیں یکجا ہو جائیں، یعنی موضوع نوجوان محقق کی دلچسپی کا نہ ہو اور اس کی سطح علمی سے اونچا بھی ہو تو اس کی مشکلیں بہت بڑھ جاتی ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات وہ مایوس ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ جب موضوع کا انتخاب اپنی دلچسپی اور اپنی سطح علمی کے مطابق ہوگا تو کام کی رفتار بھی حسب خواہش ہوگی اور نتیجہ بھی خوشگوار ہوگا۔ ہندوستان میں یونیورسٹی کے بعض رہ نما بعض اوقات پی ایچ ڈی کے

طلبہ کو اپنا پسند کیا ہوا موضوع اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں۔ مختصر یہ کہ جہاں تک ممکن ہو موضوع کا انتخاب محقق خود کرے تا کہ وہ اس کی دلچسپی کا بھی ہو اور اس کی صلاحیت کے مطابق بھی ہو۔ البتہ وہ اپنے موضوع کی اہمیت، افادیت، جدت، مواد کی فراہمی کے امکانات وغیرہ سے متعلق اپنے رہ نما سے مشورہ ضرور کر سکتا ہے اور اسے کرنا چاہئے۔

مینول آف تھیسس رائٹنگ (A Manual of Thesis Writing) کے مصنفین کی رائے میں اگر نوجوان محقق موضوع کا انتخاب کرنے سے پہلے اپنے آپ سے مندرجۂ ذیل سوالات کرے تو یہ اس کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں:

۱۔ کیا یہ موضوع اس لائق ہے کہ اس پر تحقیق کی جائے؟

۲۔ کیا اس موضوع پر تحقیق مکمل ہو سکتی ہے؟

۳۔ کیا اس موضوع پر تحقیق کرنا میرے لئے ممکن ہے؟

۴۔ کیا اس موضوع پر میں تحقیق کر سکتا ہوں؟[1]

ان سوالوں کے جواب کے لئے مصنفین مذکور نے جو اشارے کئے ہیں انھیں بھی مختصراً نیچے دیا جاتا ہے:

۱۔ تحقیق کا مقصد کوئی نئی حقیقت پیش کرنا یا نئی بات کہنا ہے، اس لئے اس سوال کے جواب کے لئے وہ اپنے رہنما یا کسی اور تجربہ کار محقق سے مدد لے سکتا ہے۔

۲۔ اس موضوع پر مواد ملنے کے امکانات ہیں یا نہیں؟ اس کے جواب کے لئے بھی وہ اپنے رہنما یا کسی ماہر محقق سے مشورہ کر سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک موضوع سے اس کی ذاتی دلچسپی کا تعلق ہے اس کا جواب وہ خود دے سکتا ہے۔

۳۔ اس سوال کے جواب کے لئے وقت، متعلقہ زبان یا زبانوں کا علم اور بعض مضامین کی صورت میں اخراجات وغیرہ کے نقطۂ نگاہ سے خود اسے غور کرنا ہوگا۔

۴۔ اس سوال کے جواب کے لئے اسے اپنے طبعی رجحان، صلاحیت وغیرہ کا جائزہ لینا

---

[1] A Manual of Thesis Writing , A. H. Cole and K. W. Bigelow۔ چاپ ہشتم، باب ۱، ص ۲

ہوگا۔[1]

موضوع کا انتخاب کرتے وقت مندرجۂ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱۔موضوع نیا اور اہم ہو۔تکرارِ مضمون سے نہ علم وادب میں اضافہ ہوگا اور نہ محقق کو کوئی فائدہ پہنچے گا۔اس کا یہ مقصد نہیں کہ صرف ایسے موضوع کا انتخاب کیا جائے جس پر اب تک کچھ نہ لکھا گیا ہو یا بہت کم لکھا گیا ہو۔کوئی کتاب یا مقالہ حرفِ آخر نہیں ہوسکتا۔موضوع میں نئے نئے زاویئے پیدا ہوں گے۔بقول وھٹنی تحقیق میں جدت ایک اضافی صفت ہے اور کسی مضمون میں کسی ایسے موضوع کا ملنا جس کو مفکرانہ خیالات کی سطح نے نہ چھوا ہو، ناممکن ہے۔[2] اس لئے ایسے موضوع کا ملنا جس کو مفکرانہ خیالات کی سطح نے نہ چھوا ہو، ناممکن ہے۔اس لئے ایسے موضوع کا بھی انتخاب کیا جاسکتا ہے جس پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔البتہ موضوع جس نقطۂ نگاہ سے پیش کیا جائے وہ نیا ہو۔پرانے موضوع میں بھی جدت پیدا کی جاسکتی ہے۔ایک مثال کافی ہوگی۔خیام پر بہت سی کتابیں اور مقالے اچھے اچھے مصنفوں کے قلم سے لکھے جاچکے تھے۔لیکن (مولانا) سید سلیمان ندوی نے چوں کہ خیام سے متعلق نئے نئے گوشوں پر روشنی ڈالی اس لئے اس پرانے موضوع میں جدت پیدا ہوئی اور ان کی تصنیف کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

۲۔موضوع سے علم کی شاخ کو جس میں تحقیق کی جارہی ہے، کیا فائدہ پہنچے گا۔جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے، تحقیق کا مقصد علم وفن کو ترقی دینا ہے۔تحقیق علم میں بے شمار چھوٹے چھوٹے اضافے کرکے انسانی بہبودی میں حصہ لیتی ہے۔محقق میں چیونٹی کی بعض خصوصیات ہوتی ہیں جو اپنے ڈھیر پر ایک ایک دانہ کا اضافہ کرتی ہے۔[3]

۳۔جس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور آسانی سے مواد مل سکتا ہے، نوجوان محقق کو اس کے انتخاب سے بچنا چاہئے، کیوں کہ جب مواد کی کثرت ہوگی تو اس کا ترتیب دینا اور

---

[1] A Manual of Thesis Writing , A. H. Cole and K. W. Bigelow۔، چاپ ہشتم، باب ۱، ص ۲

[2] F. L. Whitney۔، کتاب مذکور، باب ۳، ص ۸۹، ۹۰

[3] Research in Education, J. W. Best۔، باب ۲، ص ۱۶

نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہوگا۔ اور اگر یہ ہو بھی جائے تو ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس میں جدت پیدا کرنا مشکل ہوگا۔

۴۔ایسے موضوع سے بھی بچنا چاہئے جسکے لئے مواد کی فراہمی کے امکانات کم ہوں۔

۵۔موضوع بہت وسیع و بسیط نہ ہو۔ وسیع موضوع کی صورت میں کامل کا ایک جزو تحقیق کے لئے منتخب کرنا بہتر ہوگا۔ مثلاً ''اردو نثر کے اسالیبِ بیان'' ایک وسیع موضوع ہے۔ اسے اس طرح مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

اردو نثر کے اسالیبِ بیان

قدیم اردو نثر کے اسالیبِ بیان

۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کی اردو نثر کے اسالیب بیان

۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کی اردو نثر کے اسالیبِ بیان

آزادی کے بعد کی اردو نثر کے اسالیبِ بیان

۶۔بہت محدود موضوع کا انتخاب بھی مناسب نہیں۔ اس صورت میں نوجوان محقق کے ہمت ہارنے کا اندیشہ ہے۔

۷۔جس موضوع سے محقق کو کسی قسم کی نفرت ہو یا اسکے متعلق اس نے کچھ خاص قسم کے تصورات قائم کر لئے ہوں، اس کا انتخاب نہ کرے۔[1] محض تنقیص کی غرض سے تحقیق کرنا ایک بے معنی سی بات ہے۔ ایسی تحقیق سے تحقیق کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا۔ یعنی ایسی تحقیق سے علم و ادب میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

۸۔موضوع نہ صرف محقق کے لئے دلچسپ ہو بلکہ طبع و اشاعت کی صورت میں قاری کی بھی دلچسپی کا باعث بن سکے اور کتاب کے مطالعہ سے اسکے علم میں اضافہ بھی ہو اور اسے مسرت بھی حاصل ہو۔[2]

---

[1] C. B. Wlulams and A. H. Stevenson۔، ترمیم شدہ اڈیشن، باب ۴، ص ۶۴

[2] ایضاً

مآخذ کی عارضی فہرست

تحقیق میں دوسرا اہم قدم مآخذ کی فہرست تیار کرنا ہے، یعنی محقق جس موضوع پر مقالہ لکھنا چاہتا ہے اس پر کتابوں، رسالوں، مضمونوں وغیرہ کی شکل میں اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کی ایک فہرست تیار کرے۔ وہ پہلے ان کتابوں، مضمونوں وغیرہ کی فہرست بنائے جو اس کے ذہن میں موجود ہیں۔ اسکے بعد تلاش شروع کرے۔ یہ کام دقت طلب اور صبر آزما ہے۔ نوجوان محقق کو مستقل مزاجی سے کام لینا ہوگا۔ اس موقع پر اسے تفصیلی یا تنقیدی طور پر پڑھنے کی ضرورت نہیں، بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس کے موضوع سے متعلق کام کی چیزیں ہیں یا نہیں، اور ساتھ ہی اسے موضوع کی اہمیت، وسعت، مواد کی قلت، غلطیوں، غلط اخذ نتائج وغیرہ کا پتا چل جائے، اور اچھے اور برے اور مفید اور غیر مفید مواد میں تمیز ہو جائے۔ بعض اوقات یہ کام کتاب کی فہرستِ مندرجات یا اشاریہ سے بھی لیا جا سکتا ہے۔

فہرست مآخذ اگر "۵ x ۳ کے پتلے کارڈ یا تراشے (سلپ) پر تیار کی جائے تو بہتر ہے۔ ایک کارڈ یا تراشے پر صرف ایک کتاب کا نام ہونا چاہئے اس میں مندرجۂ ذیل پانچ باتیں لازمی طور پر درج کی جائیں:

(الف) مصنف یا مرتب کا نام (ب) کتاب کا نام (اگر ایک سے زیادہ جلدوں میں ہے تو جلد کا نمبر)، (ج) مقامِ اشاعت (د) ناشر (ہ) سالِ اشاعت (اگر ایک سے زیادہ اڈیشن ہیں تو اڈیشن کا نمبر)

مثلاً

میر، میر تقی		ذکرِ میر
اورنگ باد،	انجمن ترقی اردو، ہند	۱۹۲۸ء

اگر محقق چاہے تو اپنی سہولت کے لئے کارڈ پر اور باتیں بھی لکھ سکتا ہے۔ مثلاً باب، صفحہ

یا صفحات کا نمبر درج کر لینا مناسب ہوگا اسی طرح لائبریری کا Call Number بھی نوٹ کر لینا اس کے لئے مفید ہوگا۔ ایسی صورت میں اسے دوبارہ لائبریری کا کارڈ دیکھنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔

رسالہ کے مضامین کی فہرست بنانے میں مندرجۂ ذیل باتیں نوٹ کرنا ہوں گی:

(الف) مضمون نگار کا نام (ب) مضمون کا عنوان (واوین میں) (ج) رسالہ کا نام (د) جلد اور شمارہ (بریکیٹ میں سال بھی دے دیا جائے تو بہتر ہے) (ہ) صفحات

مثلاً

شیخ چاند، ''سودا کی حیات اور کلام کے متعلق غلط فہمیاں اور غلط بیانیاں''
اردو (سہ ماہی)، جلد ۱۴، نمبر ۲ (۱۹۳۴ء)
صفحات ۳۷۰-۳۴۱

فہرست مآخذ ایک ہی بار میں مرتب نہیں ہو سکتی۔ اس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہے گا۔ بہت سی کتابوں کے نام خارج بھی ہو جائیں گے، یہاں تک کہ کتاب یا مقالہ مکمل ہونے تک ایک نئی فہرست تیار ہو جائے گی۔ اس فہرست میں صرف ان کتابوں، رسالوں وغیرہ کے نام ہوں گے جن سے مقالہ میں استفادہ کیا گیا اور جن کا حوالہ دیا گیا ہے۔

بنیادی ذرائع:

سارے ممکن الحصول مواد کو سارے ممکن ذرائع سے اکٹھا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ تلاش و جستجو بنیادی ذرائع سے ہو۔ بنیادی ذرائع سے حاصل کیا ہوا مواد مستند ترین ہوتا ہے، اسلئے جہاں تک ممکن ہو یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔ صرف مجبوری کی حالت میں ثانوی ذرائع کی طرف رخ کیا جائے۔ ایک کتاب عربی میں ہے اور اس کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے۔ اگر محقق عربی جانتا ہے تو اصل کتاب سے استفادہ کرے نہ کہ ترجمہ سے، کیونکہ

ترجمہ ثانوی درجہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ریسرچ اینڈ رپورٹ رائٹنگ (Research and Report Writing) کے مصنفین مندرجۂ ذیل ذرائع کو بنیادی ذرائع میں شمار کرتے ہیں:

۱۔ تجربے
۲۔ ذاتی تفتیش وتلاش: انٹرویو اور سوالنامہ
۳۔ تحقیقی مقالات ومضامین جو پیشہ ورانہ رسالوں میں شائع ہوئے
۴۔ خطوط، ڈائریاں اور خودنوشتہ سوانح عمریاں
۵۔ فن اور ادب کی تخلیقی تحریریں
۶۔ حکومت، میونسپلٹی، بورڈ وغیرہ کی روئدادیں
۷۔ تحقیقی اداروں، دانش گاہوں وغیرہ کی روئدادیں
۸۔ اخبارات

اس فہرست میں مندرجۂ ذیل کا اضافہ کیا جاسکتا ہے:

۹۔ مخطوطات
۱۰۔ فرامین

سوالنامہ:

بسٹ (Bist) نے اچھے تعلیمی سوالنامہ کی آٹھ خصوصیات بتائی ہیں۔ ان میں سے مندرجۂ ذیل سات علمی وادبی سوالنامہ کے لئے یکساں اہم ہیں:

۱۔ سوالات کسی اہم موضوع سے متعلق ہوتے ہیں تاکہ اس کی اہمیت مجیب کو جواب دینے پر مائل کرسکے۔ موضوع کی اہمیت سوالنامہ میں واضح اور محتاط طور پر بتادی جائے۔
۲۔ صرف ایسے سوالات پوچھے جاتے ہیں جن کے جواب دوسرے ذرائع سے نہ مل سکتے ہوں۔

۳۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے سوالنامہ مختصر ہوتا ہے۔

۴۔ سوالنامہ ظاہری طور پر جاذب نظر ہوتا ہے، عمدگی سے ترتیب دیا جاتا ہے اور صفائی سے لکھا جاتا ہے۔ (یا مطبوعہ ہوتا ہے)

۵۔ ہدایات واضح اور مکمل ہوتی ہیں۔ اہم اصطلاحات کی تشریح کردی جاتی ہے۔ ایک سوال میں صرف ایک بات پوچھی جاتی ہے۔ ہر سوال صاف اور سادہ لفظوں میں لکھا جاتا ہے اور اس انداز سے لکھا جاتا ہے کہ اس کا جواب آسانی سے، ٹھیک ٹھیک اور واضح طور پر دیا جاسکے۔

۶۔ سوالات صرف نفسِ امر سے متعلق ہوتے ہیں اور مطلوبہ جواب کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے۔

۱۔ سوالات نفسیاتی ترتیب کے ساتھ (یعنی عام سے خاص) پیش کئے جاتے ہیں۔ ترتیب مجیب کو اس کے خیالات مرتب کرنے میں مدد دیتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے جوابات منطقی ترتیب کے ساتھ ہوتے ہیں اور نفس امر سے متعلق ہوتے ہیں۔ بہتر ہے کہ پہلے ایسے سوالات پیش کئے جائیں جن کا اثر مجیب پر خوشگوار ہو، اور پھر نازک اور دقیق سوالات پوچھے جائیں۔ پریشان کن سوالات سے پرہیز کیا جائے۔[1]

سوالنامہ بھیجا جائے تو اس کے ساتھ جوابی لفافہ یا ٹکٹ ضرور بھیجے جائیں۔

باضابطہ ملاقات (انٹرویو):

باضابطہ ملاقات بھی ایک طرح کا سوالنامہ ہے۔ یہ تحریری ہوتا ہے وہ زبانی۔ سوالات بہرحال تحریری شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ انٹرویو کے سلسلہ میں چند باتوں کا خصوصاً خیال رکھنا ضروری ہے ۔ وقت کا تعین اپنی سہولت کے مطابق نہ کیا جائے بلکہ جس سے انٹرویو لینا ہے اس کی سہولت کے مطابق کیا جائے تاکہ وہ سکون واطمینان اور تفصیل سے جواب دے سکے۔ غیر متعلق سوالات ہرگز نہ پوچھے جائیں۔ جواب اسی وقت لکھ لیا جائے یا فوراً بعد تاکہ

---

[1] J. B. Best، کتاب مذکورہ، باب ۷، ص ۱۵۱

مجیب کے اصل الفاظ استعمال کئے جاسکیں۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں اگر جوابات ٹیپ ریکارڈ کر لئے جائیں تو بہتر ہو۔ اس میں سہولت بھی ہے اور خرچ بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس صورت میں جوابات اسی وقت لکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ بعد میں ٹیپ ریکارڈ کو مکمل اور مقصدی تجزیہ کی خاطر جتنی بار چاہیں سن سکتے ہیں۔ اس میں مجیب کے اصل الفاظ کے علاوہ اس کا لہجہ اور جذبات کا اتار چڑھاؤ بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔[1]

☆☆☆

---

[1] ۔۔J. B. Best، کتاب مذکورہ، باب ۷، ص ۱۶۹

باب- ۴

مقالہ کی تیاری

مآخذ کی عارضی فہرست تیار کر لینے کے بعد محقق مقالہ کی تیاری شروع کردے، یعنی اب وہ اپنے موضوع سے متعلق کتابیں پڑھنا شروع کرے۔ جیسا کہ ابتدا میں کہا جا چکا ہے، محقق کو اپنے موضوع سے متعلق ہر ممکن الحصول تحریر پڑھنے کی ضرورت ہے کیوں کہ اس کے بغیر وہ اپنے مقالہ میں جدت پیدا نہیں کر سکتا۔

پڑھنے کی اہمیت:

پڑھنے کی بھی خاصی اہمیت ہے کیوں کہ پڑھتے وقت غور وفکر بھی کرنا ہوتا ہے۔ ایک امریکن مصنف کی رائے میں پڑھنے کا فن ان تمام خصوصیات کا حامل ہوتا ہے جو انکشاف کے لئے ضروری ہیں، یعنی مشاہدہ کی تیزی، قوتِ حافظہ، تخیل اور ایسا دماغ جو تجزیہ اور غور وفکر کا عادی ہو۔[1]

موجودہ دور کی چھپی ہوئی کتابوں سے مواد تلاش کرنے میں محقق کو نسبتاً آسانی ہوگی۔ جدید مطبوعات میں عموماً کتاب کے آخر میں اشاریہ ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے محقق بڑی آسانی سے اپنے مطلب کی چیزیں ڈھونڈ سکتا ہے۔ اگر کتاب کے آخر میں اشاریہ نہ ہو یا اس کے

---

[1]۔ Haw to Read a Book, M. J. Adler، باب ۳، ص ۴

ذریعہ کامیابی نہ ہو سکے تو فہرست مضامین کو دیکھ کر پورا باب پڑھنا ہوگا۔ اگر پورا باب پڑھنے کی ضرورت پیش آئے تو اسے سرسری طور پر پڑھنا چاہئے۔ ہر باب یا کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

پی ایچ ڈی کے امیدوار کو ایک محدود وقت میں مقالہ تیار کرنا ہوتا ہے۔ عام محقق کو بھی وقت کی قدر و قیمت اور اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے پڑھنے کی رفتار تیز ہونا چاہئے۔ پڑھنے کی رفتار کو مشق و مزاولت کے ذریعہ تیز یا تیز سے تیز تر بنایا جا سکتا ہے۔ انگریزی کے ایک مشہور مصنف لِنڈ (Lynd) نے پڑھنے کی رفتار کو تیز بنانے کے لئے مندرجۂ ذیل طریقے بتائے ہیں:

۱۔ تم آسانی سے جس حد تک پڑھ سکتے ہو، کچھ دیر کے لئے اپنے آپ کو اس سے زیادہ تیز پڑھنے پر مجبور کرو۔ یہ سب سے اہم اصول ہے۔ ابتدا میں تمھیں یہ پریشانی ضرور ہوگی کہ تم اپنی خواہش کے مطابق عبارت کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہو گے۔ لیکن اس کی پرواہ نہ کرو مشق کے ساتھ یہ دِقت خود بخود دور ہو جائے گی۔ ایک ماہرِ تعلیم جس نے عبارت پڑھنے کے مؤثر طریقہ کی تحقیق میں کافی وقت صرف کیا ہے، کہتا ہے کہ میں نے اپنے پڑھنے کی رفتار کو اس طرح کافی حد تک بڑھایا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو یہ احساس دلا کر کہ میرے پڑھنے کی رفتار بلاوجہ سست ہے اور پھر استقلال کے ساتھ امکانی حد تک تیز مگر پوری توجہ کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کی تاوقتیکہ تکان محسوس ہونے لگے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ پڑھنے کی کسی حد تک ایک نئی رفتار قائم نہ ہوئی۔

۲۔ ہر سطر میں جہاں تک ممکن ہو، آنکھ کم سے کم جگہوں پر رکے۔ پڑھتے وقت نظر مسلسل حرکت نہ کرے بلکہ وقفے اور جھٹکے کے ساتھ متحرک ہوتی رہے۔ آنکھیں چھپی ہوئی عبارت کی ہر سطر کے مختلف ٹکڑوں کی تیزی سی تصویریں لیتی رہیں اور پھر انھیں یکجا کر کے ان سے مطلب پیدا کرتی ہیں۔

اصل میں نظر کی حرکت کے وقت پڑھنا نہیں ہوتا بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب نظر کی حرکت تھم جاتی ہے۔ ایک ایک لفظ نہ پڑھو بلکہ لفظوں، فقروں اور جملوں کے مجموعے کو پڑھو۔ اس طرح ایک شخص جس کے پڑھنے کی رفتار بہت سست تھی، ایک سطر ۵ء۱۵ وقفوں کی مدد سے پڑھا کرتا تھا، وہی ہر روز بیس بیس منٹ کی بیس دن کی مشق نے اس وقفہ کی اوسط کو ۱ء۱۶ کی حد تک کم کرنے میں کامیاب ہوسکا۔ سطر کے پہلے لفظ پر نگاہ نہ جماؤ بلکہ سطر کے ابتدائی حصہ میں کسی جگہ پر جماؤ۔ اسی طرح آخری وقفہ آخری لفظ پر نہ ہو بلکہ سطر کے آخری حصہ میں کسی جگہ پر ہو۔

۳۔ کسی چھوٹے ہوئے لفظ یا لفظوں کو دوبارہ پڑھنے کی خاطر نگاہ کو پیچھے نہ پلٹاؤ۔ اس کا خیال اسی وقت سے کرنا ہوگا جب تم نے یہ طے کرلیا کہ تم اپنے پڑھنے کی رفتار کو تیز کروگے۔ نگاہ کو پلٹانے کا سب سے عام سبب یہ ہے کہ پیش رو سطر کے آخر تک نگاہ پلٹتے وقت صحیح سطر پر نہیں پڑتی۔ پڑھتے وقت ہر قسم کے موضوع پر الگ الگ مؤثر طریقہ سے یہ تجربہ کرو کہ نگاہ صحیح سطر پر پڑے۔

۴۔ نظر کی حرکت میں ایک مسلسل موزونی (سُر) قائم کرو۔ یہ موزونی زیر مطالعہ کتاب کی سطروں کی لمبائی اور مواد کی مناسبت سے ہوگی۔ اس سُر کے ساتھ ہر سطر میں اپنے آپ کو جھولتا ہوا محسوس کرو۔ شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر بسول (Buswel) نے بتایا ہے کہ ''ایک پڑھنے والے کی نظر کی حرکت میں دیکھا جاسکتا ہے کہ آنکھ ایک سطر دوسری سطر پر ایک موزوں جھٹکے کے ساتھ پہنچتی ہے اور ہر سطر پر وقفے تقریباً برابر ہوتے ہیں اور پیچھے لوٹنے والی حرکات بہت کم ہوتی ہیں یا بالکل نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس ایک خام پڑھنے والا کبھی نگاہ کو آگے لے جاتا ہے اور کبھی پیچھے لاتا ہے تاکہ ایک لفظ جو واضح نہیں ہوا تھا، واضح ہوسکے اور پھر نگاہ کو آگے لے جاتا ہے،

اور پھر فوراً پیچھے لے آتا ہے۔

۵۔ پڑھتے وقت منہ سے آواز نہ نکلے بلکہ ہونٹ بھی نہ ہلنے پائیں کیونکہ آواز نکلنے یا ہونٹ ہلنے کی وجہ سے پڑھنے کی رفتار سست ہوجاتی ہے[1]

مواد کی فراہمی کے لئے جو مطالعہ کیا جاتا ہے اس کے سلسلے میں وھٹنی نے مندرجۂ ذیل مفید اور عملی ہدایتیں دی ہیں:

محقق کو ہمیشہ یہ جاننا چاہئے کہ اسے کس قسم کی تحریروں کو توجہ سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ یہ اس سلسلہ کی سب سے اہم کڑی ہے۔ وہ ہر تحریر کو جو اسے دستیاب ہوتی ہے یکساں توجہ یا رفتار سے نہیں پڑھ سکتا۔ وقت اس کی اجازت نہیں دیتا اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات محض ٹائٹل یا ابواب کی سرخیوں اور دیباچہ پر نگاہ ڈال لینا کافی ہوگا۔ بعض کتابوں کا اشاریہ دیکھ لینے سے مقصد پورا ہوسکتا ہے۔ اسی طرح بعض ابواب کو تیزی سے سرسری طور پر پڑھنا چاہئے۔ بعض کتابوں کو آہستہ اور توجہ سے پڑھنا ہوگا اور پڑھنے کے ساتھ نوٹ بھی لینا ہوگا۔ بعض کتابوں اور مضمونوں کو دوبارہ پڑھنے کے لئے الگ رکھ دینا ہوگا۔

ہماری زبان کے مشہور عالم و محقق (مولانا) شبلی کے مطالعہ کا انداز کچھ اسی قسم کا تھا۔ ان کے سوانح نگار (مولانا) سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ:

''مطالعہ کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی کتاب اول سے آخر تک نہیں پڑھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اگر یہ طریقہ اختیار کروں تو ایک ہی کتاب میں الجھ کر رہ جاؤں۔ بے ترتیبی کے ساتھ اوراق الٹتے پلٹتے رہتے تھے اور نہایت سرعت کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے۔ لیکن بایں ہمہ کتاب میں جو بہترین معلومات ہوتیں ان پر نگاہ پڑ جاتی اور ان معلومات پر اس قدر حاوی ہوجاتے کہ کتاب

---

[1] F. L. Whitney۔ کتاب مذکور، باب ۴، ص ۱۰۲، ۱۰۳ بحوالہ: "You Have More Time to Read", R. S. Lynd

پر ریویو کرنے کے لئے بالکل تیار ہو جاتے۔''[1]

لیکن مخطوطات کو شروع سے آخر تک پڑھنا ہوگا کیوں کہ وہاں اشاریہ اور فہرست مضامین تو الگ رہے بعض اوقات فصول و ابواب تک نہیں ہوتے۔ تذکروں کو بھی شروع سے آخر تک پڑھنا ہوگا کیوں کہ بعض اوقات ایک شاعر کے متعلق کسی دوسرے شاعر کے سلسلۂ حالات میں بھی کچھ کام کی باتیں مل جاتی ہیں۔

نوٹ لینا:

مقالے مختلف نوعیتوں کے ہوتے ہیں اسی لئے ان کی تیاری کے طریقے بھی مختلف ہوں گے لیکن ایک بات عام ہے اور وہ ہے مقالہ کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنا۔ مقالہ کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ مواد کی گرد آوری میں سہولت ہوگی اور اس سے کہیں زیادہ سہولت مواد کو ترتیب دینے میں ہوگی۔ اس تقسیم کے بعد ہر حصہ کا خاکہ تیار کیا جائے۔ خاکہ میں عنوانات قائم کرنا (اور اگر ممکن ہو تو ذیلی سرخیاں قائم کرنا) سب سے پہلی شرط ہے۔ انھی عنوانات کے مطابق محقق نوٹ لینا شروع کرے۔ خاکہ بنانے، سرخیاں قائم کرنے اور نوٹ لینے میں گہرا تعلق ہے۔ اچھے مقالہ کی تیاری کے لئے محتاط، صحیح اور مکمل نوٹ ضروری ہیں۔ مناسب نوٹ کے بغیر مقالہ میں منطقی ترتیب، محکم استدلال اور سلیس و خوشگوار تحریر ممکن نہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے نوٹ لینے میں مہارت حاصل کرنا تحقیق کا ابتدائی اہم قدم ہے۔[2]

نوٹ لینے کے سلسلہ میں ریسرچ مینول کے مصنفین نے صحیح کہا ہے کہ دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ بیکار قسم کے نوٹ نہ لئے جائیں اور دوسری یہ کہ کوئی ضروری بات چھوٹنے نہ پائے۔ بیکار قسم کے نوٹ مقالہ لکھنے وقت دردِ سر کا باعث ہوں گے۔ ضروری نوٹ چھوٹ جانے سے یہ نقصان ہوگا کہ یا تو مقالہ کی قدر و قیمت میں کمی محسوس ہوگی یا محقق کو دوبارہ تلاش پر مائل ہونا پڑے گا۔[3]

---

[1]۔ (مولانا) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۸۲۷

[2]۔ C. V. Good and D. E. Scates، کتاب مذکور، باب ۱۰، ص ۸۳۶

[3]۔ C. B. Williamsund A. H. Stevensen، کتاب مذکور، ترمیم شدہ اڈیشن، باب ۶، ص ۸۶

نوٹ لینے کا عموماً یہ طریقہ رہا ہے کہ محقق ایک بیاض میں مسلسل نوٹ لیتا جاتا تھا۔ آج کل بھی ہندوستان میں بہت سے لوگ تقریباً اسی انداز سے نوٹ لیتے ہیں۔ اس طریقہ کو اچھا نہیں کہا جاسکتا۔ اس صورت میں ایک ہی سرخی کے تحت مختلف جگہوں میں نوٹ ہوتے ہیں اور مقالہ لکھتے وقت خاصی الجھن ہوتی ہے۔ اگر تاشوں یا پتلے کارڈوں پر نوٹ لئے جائیں تو بہتر ہے، یعنی ہر نوٹ الگ الگ تراشے یا کارڈ پر ہو۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ نوٹوں کو حسبِ ضرورت دوبارہ ترتیب دیا جاتا ہے۔ ایک تراشے پر صرف ایک پہلو سے متعلق نوٹ لیا جائے۔ اگر نوٹ لمبا ہے تو دو یا دو سے زیادہ تراشے استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ ہر تراشے کے دائیں سرے پر سرخی یا ذیلی سرخی ضرور لکھ لی جائے تاکہ انھیں ترتیب دیتے وقت سہولت ہو۔ ہر تراشے کو اسکی مستقل سرخی کے تحت رکھا یا فائل کیا جائے۔ یہ تراشے یا کارڈ عموماً "۶×۴ کے ہوتے ہیں۔ "۸×۵ یا "۱۱×۸ کے کاغذ بھی استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ ریسرچ مینول کے مصنفین یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ یہ تراشے مختلف رنگوں کے ہوں تو بہتر ہے۔[1] رنگوں کی تفریق عنوانات کے لحاظ سے کی جاسکتی ہے۔ ہر نوٹ کے آخر میں مصنف کا نام، کتاب کا نام، باب، صفحہ یا صفحات ضرور لکھ لینا چاہئے تاکہ (حوالہ سے قطع نظر) اگر دوبارہ اسے پڑھنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ آسانی سے مل جائے۔

نوٹ لینے کے سلسلہ میں بِسٹ (Bist) نے نوجوان محقق کو چند اچھے مشورے دئے ہیں۔ ان پر عمل کرنا اس کے لئے مفید ہوگا۔

۱۔ نوٹوں کو دوبارہ نقل یا ٹائپ کرنے کا خیال ذہن میں نہ لاؤ۔ اس سے وقت کا نقصان ہونے کے علاوہ غلطیوں کے راہ پانے کا بھی امکان ہے۔

۲۔ ہمیشہ اپنے ساتھ تھوڑے سے تراشے یا کارڈ رکھو تاکہ جب کوئی نیا خیال بس کے انتظار میں، بس میں بیٹھے ہوئے، کسی لکچر یا بحث کے دوران ذہن میں آئے تو اسے فوراً لکھ لو۔

۳۔ نوٹوں کو احتیاط سے رکھو تاکہ وہ کھو نہ جائیں۔ اگر انھیں کہیں لے جانے کی

---

[1] C. B. Williams and A. H. Stevenson۔ کتاب مذکور، ترمیم شدہ اڈیشن، باب ۶، ص ۸۷

ضرورت پڑے تو فائل فولڈر میں رکھ کر لے جاؤ اور اس پر اپنا نام اور پتا ضرور لکھ لو۔

۴۔ مقالہ لکھنے کے بعد بھی نوٹوں کو محفوظ رکھو۔ ممکن ہے کہ بعض نوٹ کسی اور موضوع پر لکھنے کے سلسلہ میں کام آسکیں۔[1]

نوٹ مختلف طریقوں سے لئے جاسکتے ہیں، مثلاً مصنف کی اصل عبارت (اقتباس) یا مصنف کی عبارت کا اختصار یا مصنف کی عبارت کا مفہوم اپنے الفاظ میں لکھنا۔ مصنف کی عبارت یا عبارت کے مفہوم کے ساتھ ساتھ اگر ضرورت ہو تو محقق اپنے رائے بھی مختصراً لکھتا جائے۔

اقتباس کا استعمال بہت زیادہ کرنا مناسب نہیں۔ ریسرچ مینول کے مصنفین کی رائے میں اس کا استعمال ایسی صورت میں کرنا چاہئے کہ مصنف نے بات کے کہنے کے لئے جن الفاظ کا استعمال کیا ہے وہی بہترین ہیں۔ دوسرا استعمال یہ ہے کہ مصنف کی عبارت حسن انشا کا عمدہ نمونہ ہے اور محقق اپنی مسرت میں اپنے قارئین کو بھی شریک کرنا چاہتا ہے۔[2] اپنی بات کو مستند اور زیادہ وزن دار بنانے کے لئے بھی اقتباس کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

محقق جس طریقہ پر چاہے نوٹ لے لیکن اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ وہ صفائی کے ساتھ لکھے جائیں۔ ایسی صورت میں مقالہ لکھتے وقت سہولت ہوگی۔

چارٹ، نقشے وغیرہ:

موجودہ دور میں نقشوں، چارٹوں وغیرہ کی اہمیت ومقبولیت بہت بڑھ گئی ہے، اس لئے اس کا اہتمام جہاں تک ممکن ہو ضرور کیا جائے۔ نقشے، چارٹ وغیرہ مصور ومشرح مثالیں ہیں اس لئے بات واضح تر ہوجاتی ہے اور آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ ان مثالوں کے ذریعہ محقق اپنے دعوے کو زیادہ مضبوط اور وزنی بھی بنا سکتا ہے۔

---

[1] J. B. Best، کتاب مذکور، باب ۳، ص ۸۱

[2] C. B. Williams and A. H. Smevenson، کتاب مذکور، چاپ اول، باب ۶، ص ۵۶

ان مصور ومشرح مثالوں کا استعمال مضمون یا موضوع کے لحاظ سے ہوگا۔ مثلاً تاریخی مقالہ یا کتاب میں جنگ یا جنگوں کے نقشے دئے جاسکتے ہیں۔ تعلیمی کتاب یا مقالہ میں چارٹ، گراف وغیرہ تعلیم کی تدریجی رفتار بتانے یا دوسرے مسائل کو سمجھانے میں مفید ومعین ثابت ہوں گے۔ ادبی مقالہ یا کتاب میں متعلقہ مخطوطہ کا عکس، پرانی عمارت کا فوٹو وغیرہ اس کی اہمیت میں اضافہ کا باعث ہوں گے۔ زینتی تصویریں بھی کتاب کی افادیت واہمیت بڑھاتی ہیں، اس لئے ان کا بھی اہتمام ضرور کیا جائے۔

چارٹ، گراف، ڈائگرام وغیرہ محقق خود نہ بنائے بلکہ کسی اچھے ڈرافٹس مین سے بنوائے۔ پرانی تصویروں کے حصول کے لئے اسے پرانے معیاری رسالوں کے ورق الٹنا ہوں گے۔ لیکن پرانی عمارتوں یا دوسرے آثار کے نئے فوٹو لینا بہتر ہوگا، بشرطیکہ یہ ممکن ہو۔ مختصر یہ کہ اس سلسلہ میں بھی محقق کو محنت اور جانفشانی سے کام لینا ہوگا اور ساتھ ہی اسے اپنے اچھے ذوق کا ثبوت دینا ہوگا۔

☆☆☆

باب-۵

مقالہ کی تسوید

موادکی ترتیب:

سارا ممکن الحصول مواد اکٹھا کر لینے کے بعد اب ضرورت ہے کہ اسے ترتیب دیا جائے، یعنی آغازِ کار سے اب تک جو نوٹ لئے گئے ہیں انھیں ان کے عنوانات کے تحت مرتب کیا جائے۔ ان کو مرتب کرتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ جو غیر اہم یا غیر ضروری نوٹ آ گئے ہیں انھیں الگ کر دیا جائے۔ نوجوان محقق کو اپنے جمع کئے ہوئے تمام نوٹ عزیز ہوتے ہیں اس لئے غیر ضروری نوٹوں کو الگ کرنے میں وہ ہچکچاہٹ محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن مقالہ کی اہمیت کے پیش نظر اسے یہ بہر حال کرنا ہوگا۔[1] جس طرح نوٹ لیتے وقت باقاعدگی اور احتیاط کا خیال رکھا گیا تھا اسی طرح انھیں ترتیب دیتے وقت بھی باقاعدگی اور احتیاط ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جس کام میں تنظیم و ترتیب ہوتی ہے اس کا نتیجہ خاطر خواہ و خوشگوار ہوتا ہے۔

---

[1] A. H. Cole and K. B. Bigelow۔ کتاب مذکور، باب ۲، ص ۲۲

مقالہ کی تسوید:

مواد کی ترتیب کے بعد مقالہ لکھنے کا کام شروع ہوتا ہے۔ مواد کی تلاش، چھان بین اور ترتیب میں جس محنت، دیانت اور دقت نظر کا ثبوت دیا گیا ہے، مقالہ کی تسوید میں بھی اس کا اہتمام ضروری ہے۔ واضح فکر، مواد کی منطقی ترتیب، صحیح ترجمانی اور مؤثر طرزِ تحریر میں ایک قطعی رشتہ ہے۔[1] چوں کہ مقالہ علمی ہے اسلئے اس کے پیش کرنے کا انداز بھی علمی ہونا چاہئے، یعنی تحریر میں عالمانہ وقار و تمکنت ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے بلاوجہ خشک بنایا جائے علمی انداز تحریر کے باوصف اسلوب بیان شگفتہ ہوسکتا ہے۔ افلاطون کے فلسفیانہ مکالمے انشا پردازی کے حسن سے خالی نہیں۔ گبن کی تاریخ، زوالِ سلطنتِ روما، اپنی تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ انشا پردازی کا بھی ایک کارنامہ سمجھی جاتی ہے۔ اردو میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں، مثلاً (مولانا) شبلی، (مولانا) سید سلیمان ندوی وغیرہ کی تصانیف۔ (مولوی) عبدالحق کی تحریریں اپنی سادگی کے باوجود دلکش ہیں۔

اچھے اور مؤثر اسلوب بیان کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ دنیا میں جتنے بڑے بڑے مصنف اور انشا پرداز ہوئے ہیں، ان کا موضوع ادب رہا ہو یا فلسفہ، افسانہ رہا ہو یا تاریخ، ناول رہا ہو یا سوانح عمری، سب نے اپنی تحریروں پر بارہا نظر ثانی کی ہے۔ ولیم جیمز نے اپنی مشہور کتاب 'سائیکالوجی' کا تقریباً ہر صفحہ چھ مرتبہ لکھا۔[2] ٹالسٹائی نے اپنا ناول War and Peace سات مرتبہ اپنی بیوی سے نقل کرایا۔ اناطول فرانس آٹھ بار پروف دیکھتا تھا۔ اور بالزاک تو ناقابل یقین حد تک پہنچ گیا تھا، یعنی ستائیس بار۔ روسو اپنے کمرے سے دوڑ کر پریس جاتا اور اپنے مسودہ کے بعض حصوں پر نظر ثانی کرتا۔[3] میکالے کا انگریزی کے بہترین انشا پردازوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا ایک مسودہ لندن میوزیم میں رکھا ہے۔ اس میں ... جابجا کاٹ چھانٹ اور حک و اصلاح پائی جاتی ہے، یہاں تک کہ بعض فقرے دس دس دفعہ

---

[1] C. V. Good and D. E. Scates، کتاب مذکور، باب ۱۰، ص ۸۳۳

[2] C. V. Good and D. E. Scates، کتاب مذکور، باب ۱۰، ص ۸۷۷

[3] Style, F. L. Lucas، باب ۱۱، ص ۲۳۲

کاٹے گئے ہیں۔''[1] (مولانا) شبلی کی عبارت میں جو رعنائی و برنائی پائی جاتی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ وہ اپنی کوئی تحریر متعدد بار کی کاٹ چھانٹ کے بغیر کتابت کے لئے نہیں دیتے تھے۔ اسی بار بار کی نظر ثانی اور حک و اصلاح کا نتیجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں شگفتگی کے علاوہ اختصار عبارت صحیح معنوں میں پایا جاتا ہے، یعنی کوئی جملہ غیر ضروری نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسلوب بیان کی ایک دوسری اہم شرط، وضاحت بیان کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ بات کو پوری تفصیل کے ساتھ کہتے ہیں۔ ابہام کا ان کے یہاں گذر نہیں۔ یہی صحیح معنوں میں ایجاز ہے۔ ایسی ہی عبارت پڑھنے والے کو مستفیض بھی کرتی ہے اور محظوظ بھی۔ اردو میں ایجاز کی بہترین مثالیں (مولانا) شبلی اور (مولوی) عبدالحق کے یہاں ملتی ہیں۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی نے آٹھ صفحوں کا ایک رسالہ پی ایچ ڈی کے طلبہ کی عملی ہدایت کے لئے شائع کیا ہے۔ اس میں پہلی بات یہی کہی گئی ہے کہ ایجاز مقالہ کا اہم ترین وصف ہے۔[2] پروفیسر لوکس ایجاز کو خوش اخلاقی کا ایک روپ بتاتے ہیں، کیوں کہ اس کی وجہ سے کتاب پڑھنے والے کا وقت ضائع نہیں ہوتا۔[3] ان کی یہ رائے صائب ہے کہ ایجاز کا مقصد کم لکھنا نہیں ہے بلکہ بہتر لکھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایجاز سے عبارت میں حسن، زور اور روانی پیدا ہوتی ہے۔[4] ان خوبیوں کے علاوہ ایجاز کی وجہ سے جملے معنی خیز ہوتے ہیں۔[5] ایک پانچویں خوبی یہ ہے کہ بات میں کسی قسم کا جھول نہیں رہ جاتا بلکہ وہ بالکل واضح ہوجاتی ہے۔[6] ایک اچھا مصنف صرف یہی نہیں جانتا کہ اسے کیا لکھنا چاہئے بلکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اسے کیا نہیں لکھنا چاہئے۔ اس کا ایجاز وضاحت پیدا کرتا ہے اور وضاحت ایجاز کا

---

[1] ۔خواجہ الطاف حسین حالی، حیات سعدی، دوسرا باب، ص ۸۹

[2] ۔Notes on the Presentation of Theses on Literary Subjects. ص ۳

[3] ۔F. L. Lucas، کتاب مذکور، باب ۴، ص ۹۵

[4] ۔ایضاً، ص ۷۳

[5] ۔ایضاً، ص ۸۷

[6] ۔ایضاً، ص ۸۸

باعث ہوتی ہے[1] اور یہی انشا پردازی کا کمال ہے۔

لیکن ایجاز اور ابہام کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں، اسلئے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر خیالات کا اظہار واضح طور پر نہ ہوسکا تو اسلوب ناقص کہلائے گا۔ بقول مڈلٹن مرے، اسلوب کا دارومدار واضح اظہارِ خیال پر ہے۔ جہاں یہ نہیں وہاں اسلوب نہیں۔[2] شاید اسی لئے اناطول فرانس نے صرف وضاحت ہی کو اسلوب کے لئے سب کچھ کہا ہے: پہلے وضاحت، پھر وضاحت اور آخر وضاحت۔[3] اور یہ وضاحت صرف محنت کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے۔ انگریز نقاد نے واضح نثر کو موسم بہار کی خوشگوار ہوا سے تشبیہ دی ہے۔

اسلوب بیان سے متعلق (مولانا) حالی نے صحیح کہا ہے کہ'' جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ کلام میں لذت اور قبولیت پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کے ایک ایک لفظ میں مصنف کے خونِ جگر کی چاشنی نہ ہو اور جس قدر اس میں زیادہ صفائی اور گھلاوٹ پائی جائے اسی قدر سمجھنا چاہئے کہ اس کی درستی اور کاٹ چھاٹ میں زیادہ دیر لگی ہوگی۔[4]

تحقیقی مقالہ چوں کہ واقعات وحقائق پر مبنی ہوتا ہے اس لئے اس میں لفاظی یا افسانہ طرازی، خطابت یا شاعرانہ رنگین بیانی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ یہ باتیں مقالہ کی عظمت کو کم کرتی ہیں۔ اگر مواد (حقائق) کی کمی ہے تو رنگین بیانی، لفاظی یا خطابت اس کی تلافی نہیں کرسکتی۔[5] جذباتی طرز استدلال اور ناصحانہ اندازِ بیان کے لئے بھی تحقیقی مقالہ میں کوئی جگہ نہیں۔[6] غیر متعلق بات کا ذکر کرکے یا غیر ضروری تفصیلات دے کر مقالہ یا کتاب کا حجم نہ بڑھایا جائے۔ عبارت میں یکسانی برقرار رکھنا بھی ضروری ہے۔ ابوالکلام لکھتے لکھتے آزاد لکھ

---

[1] F. L. Lucas، کتاب مذکور، باب ۴، ص ۸۸

[2] The Problem of Style, Middleton Murry، باب ۴، ص ۶۶

[3] F. L. Lucas، کتاب مذکور، باب ۳، ص ۵۵

[4] خواجہ الطاف حسین حالی، حیات سعدی، دوسرا باب، ص ۷۹

[5] C. V. Good and D. E. Scates، کتاب مذکور، باب ۱۰، ص ۸۷۶

[6] F. L. Whitney، کتاب مذکور، باب ۱۶، ص ۴۱۷

دینا یا دہلی لکھتے لکھتے شاہ جہان آباد، یا کہیں دہلی لکھ رہے ہیں اور کہیں دلی، مناسب نہیں۔ اس غیر یکساں اندازِ بیان سے پڑھنے والے کو الجھن ہو سکتی ہے۔

لفظوں کا غیر ضروری استعمال انشا پردازی پر برا اثر ڈالتا ہے۔ لفظوں میں توانائی ہوتی ہے اور توانائی کو ضائع نہیں کیا جاتا۔ اس توانائی کا صحیح استعمال عبارت میں حُسن پیدا کرتا ہے۔

''گلستان میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے اور نادر نہیں، لیکن الفاظ کی فصاحت اور تناسب نے سحر پیدا کر دیا ہے۔''[1]

لفظوں کا صحیح استعمال چینی فلسفی کون فیوشس کے نظام اخلاق میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے ایک شاگرد زالو نے اس سے کہا کہ:

> ''فرض کیجئے کہ ایک ریاست کا والی آپ کو دعوت دیتا ہے کہ آپ کے نظامِ حکومت کو چلانے میں اس کی مدد کریں۔ اس وقت آپ سب سے پہلے کیا قدم اٹھائیں گے؟ کون فیوشس نے جواب دیا، سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ الفاظ کا صحیح استعمال شروع کیا جائے۔ زالو نے مذاق سمجھا اور پھر سوال کیا۔ اس پر کون فیوشس کو غصہ آ گیا اور اس نے ترش لہجہ سے کہا، تم کتنے بد اخلاق ہو۔ اگر الفاظ صحیح نہ ہوں تو زبان واقعات کے تابع نہیں ہو سکتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی کے تمام معاملات درہم برہم ہو جائیں گے، اخلاق ناپید ہوگا، انصاف دنیا سے مٹ جائے گا، معصوم لوگ سزا پائیں گے اور گناہ گار اور مجرم آزادی سے لوگوں کو اپنے ظلم کا تختۂ مشق بنائیں گے۔ اس لئے ایک مصلح کا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ صحیح الفاظ کا استعمال کرے۔''[2]

تحقیقی مقالہ میں پیش پا افتادہ فقروں، فرسودہ ادبی مثالوں یا مثلوں، عامیانہ محاوروں، بول چال کے محاوروں، خطابات اور ڈگریوں، واحد متکلم اور مدیرانہ جمع متکلم کے استعمال سے

---

[1] ۔ (مولانا) شبلی نعمانی، شعر العجم، طبع سوم، جلد چہارم، باب اول، ص ۳۷

[2] ۔ بشیر احمد ڈار ''حکیم کون فیوشش اور چینی فلسفۂ اخلاق''، حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق، ص ۱۴

بچنا ضروری ہے۔[1] 'میں' یا 'ہم' کے بدلے مرتب، راقم سطور، مضمون نگار یا اس قسم کا کوئی دوسرا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

رائے قائم کرنے اور اس کے اظہار میں محتاط ہونا چاہئے۔ اردو میں صفات کا استعمال بہت ہوتا ہے۔ اس میں بھی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ 'بے انتہا دلچسپ'، 'نہایت ہی عمدہ'، 'بالکل بے کار'، 'ناقابل یقین' وغیرہ قسم کی رائے زنی سے بچنا چاہئے۔ اگر کسی پیش رو یا ہم عصر محقق کی کسی غلطی کی نشان دہی کی جائے تو طنز و حقارت کا اظہار نہ ہونے پائے۔ بلکہ سنجیدہ اور نرم لہجہ میں اس کی طرف اشارہ کیا جائے۔ اسی طرح مبالغہ آمیز مدح سرائی (یا اس کے برعکس دل آزار تنقید) سے پرہیز کیا جائے۔ تنقید کی حالت میں لہجہ تند و تیز نہ ہو بلکہ نرم اور ہمدردانہ ہو، یہاں تک کہ تلخ حقائق کو بھی سنجیدگی اور نرمی سے پیش کیا جائے۔

مقالہ کو ابواب پر تقسیم کیا جائے۔ ہر باب کی سرخی جلی حروف میں صفحہ کے وسط میں لکھی جائے۔ ثانوی سرخی (اگر ہے) اس کے نیچے کسی قدر خفی قلم سے ہو۔ ذیلی سرخیاں کتاب کے عام قلم سے یا ذرا جلی لکھی جائیں اور پیراگراف کی شکل میں لکھی جائیں۔ سرخیاں، جہاں تک ممکن ہو، مختصر ہوں۔

عبارت میں پیراگراف ضرور بنایا جائے۔ ایک پیراگراف میں حتی المقدور ایک ہی بات کہی جائے۔ پیراگراف نہ بہت چھوٹے چھوٹے ہوں اور نہ بہت لمبے لمبے۔ لمبے پیراگراف پڑھنے والے کے لئے تکلیف کا باعث ہوتے ہیں۔

اقتباس کی عبارت احتیاط سے نقل کی جائے اور اسے واوین'' ''میں رکھا جائے تاکہ وہ محقق کی عبارت سے نمایاں ہوسکے۔ اگر عبارت مختصر ہے، تین چار سطروں تک کی، تو اسے متن کے ساتھ اور متن کے قلم سے لکھنا چاہئے۔ لیکن اگر طویل ہے، چار سطروں سے زیادہ کی، تو اسے متن سے الگ کر کے لکھنا ہوگا اور اس کا قلم متن کے قلم سے نمایاں طور پر خفی ہوگا۔ اس کی سطریں بھی نسبتاً مختصر ہوں گی، یعنی دائیں بائیں جگہ چھوٹی رہے گی۔ اس طرح وہ متن کی عبارت سے نمایاں ہوگی۔ یورپ، امریکا وغیرہ میں اقتباس کی عبارت کو واوین کے استعمال

---

[1] C. V. Good and D. E. Scates۔ کتاب مذکور، باب ۱۰، ص ۸۷۶

کے بغیر لکھنے اور سطر کو متن کے برابر لکھنے کا چلن ہے۔ اردو میں بھی یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن اگر سطریں نسبتاً چھوٹی ہوں گی تو عبارت نمایاں رہے گی۔ لیتھو کی طباعت میں یہی صورت بہتر معلوم ہوتی ہے۔

اقتباس کی عبارت میں محذوف جملوں یا فقروں یا لفظوں کا اظہار تین نقطے (...) لگا کر کیا جاتا ہے۔ اگر جملہ یا پیراگراف کا آخری حصہ محذوف کرنا ہو تو چار نقطے (....) لگائے جائیں۔ اگر پورا پیراگراف محذوف ہے تو نقطوں کی پوری سطر سے اس کا اظہار کیا جائے۔ اقتباس کی عبارت میں کوئی اضافہ یا توجیہی شرح کرنے کی ضرورت پڑے تو اسے بریکٹ [ ] میں رکھا جائے۔ اگر عبارت میں کوئی ناقابل فہم غلطی ہے تو قیاساً اس کی تصحیح نہ کی جائے بلکہ اس لفظ یا فقرہ کے آگے قوسین میں (کذا) لکھ دیا جائے۔

بعض اوقات کسی دوسری زبان مثلاً عربی یا انگریزی کی عبارت کا ترجمہ کر کے اقتباس کے طور پر دیا جاتا ہے۔ اقتباس کسی دوسرے کی عبارت یا کلام کو اپنی تحریر میں نقل کرنے کو کہتے ہیں۔ ترجمہ کی صورت میں خیالات تو دوسرے کے ہوتے ہیں لیکن زبان اس کی نہیں ہوتی۔ اسلئے اصل اور ترجمہ میں فرق کرنے کے لئے مناسب یہ ہے کہ ترجمہ کی عبارت کو بغیر واوین کے نقل کیا جائے۔ باقی تمام شرائط وہی ہوں گی جو اصل عبارت کے لئے ضروری ہیں۔

مقالہ میں مخففات کا استعمال نہیں ہونا چاہئے۔ یہ قاری کو الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ لیکن فٹ نوٹ میں ان کا استعمال ہو سکتا ہے۔

انگریزی میں سو سے کم نمبر ہندسے کے بدلے لفظ میں لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح سیکڑے کے نمبر، مثلاً دوسو، تین سو وغیرہ لفظوں میں لکھے جاتے ہیں۔ اگر جملہ کے شروع میں نمبر آتا ہے تو اسے بھی لفظ میں لکھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اچھا ہے اور اسے اردو میں بھی اختیار کرنا چاہئے۔

حاشیہ اور حوالہ:

تحقیقی مقالہ بڑی حد تک دوسرے مصنفین کی کتابوں اور تحریروں، دستاویزوں،

روئدادوں وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے اسلئے حاشیہ میں ان کا اعتراف کرنا اور انھیں اہمیت دینا ضروری بلکہ محقق کا اخلاقی فرض ہے۔ یہ اعتراف صرف عبارت کی حد تک نہ ہو بلکہ اگر مصنف کے خیالات سے استفادہ کیا گیا ہے تو اس کا اقرار بھی ضروری ہے۔[1] دوسرے کی محنت کو بغیر اعتراف واقرار کے اپنالینا علمی وتحقیقی دیانت کے خلاف ہے۔

فٹ نوٹ کے ذریعہ جہاں مختلف مصنفوں اور کتابوں سے استفادہ کا اعتراف ہوتا ہے وہیں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ محقق کے استعمال کئے ہوئے مواد کے مستند ہونے کا بھی پتا چلتا ہے۔اس کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اسی موضوع پر یا موضوع کے کسی خاص پہلو سے متعلق زیادہ تفصیل سے جاننا چاہتا ہے تو آسانی سے وہاں تک اس کی رسائی ہوسکتی ہے۔

فٹ نوٹ کا ایک مقصد اور ہے اور وہ یہ کہ متن میں جو بات کہی گئی ہے اس کے متعلق مزید معلومات بہم پہنچانا یا کسی اصطلاح کی تشریح کرنا یا بیان کے کسی خاص پہلو کی مزید وضاحت کرنا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسروں کی یہ ہدایت نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ تشریحی فٹ نوٹ کم سے کم ہوں اور زیادہ سے زیادہ مختصر ہوں، اور جو بات متن میں جگہ پانے کی مستحق نہ ہو اسے حاشیہ میں بھی دینے کی ضرورت نہیں۔[2]

حوالہ یا فٹ نوٹ عموماً صفحہ کے آخر میں ہوتا ہے۔ حوالہ کا نمبر جملہ ختم ہونے پر علامت وقفہ (۔) کے بعد اور سطر سے ذرا اوپر یا اس مخصوص لفظ پر جس کی وضاحت مقصود ہے، دیا جائے۔ متن کی عبارت اور حوالہ یا حاشیہ کی عبارت میں فرق کرنے کے لئے بیچ میں ایک لکیر کھینچ دینا ضروری ہے۔ حوالہ یا فٹ نوٹ کی عبارت کے حروف متن کی عبارت کے حروف سے نمایاں طور پر خفی ہوں۔ ہر تشریحی نوٹ پیراگراف کی شکل میں شروع ہو۔ فٹ نوٹ لکھنے یا حوالہ دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ متن میں نمبر دیتے جائیں اور باب کے آخر میں تمام نوٹ نمبر وار درج کئے جائیں۔ کبھی کبھی تمام حوالے اور نوٹ کتاب کے خاتمہ پر درج کئے جاتے

---

[1] C. B. Williams and A. H. Stevenson۔ کتاب مذکور، ترمیم شدہ ایڈیشن، باب ۸، ص ۱۱۹، ۱۲۰

[2] Notes on the Presentation of Theses on Leterary Subjects.، ص ۴

ہیں۔ موجودہ دور میں مسودہ تیار کرتے وقت فٹ نوٹ کی عبارت (اگر پہلا طریقہ اختیار کرنا ہے) متن کی عبارت کے ساتھ ہی لیکن بریکٹ [ ] میں لکھ دی جاتی ہے۔ عبارت یا جملہ یا حوالہ سے پہلے 'ف' (فٹ نوٹ) سرخ روشنائی سے لکھ دینا چاہئے۔ اس سے کمپوزیٹر کو سہولت ہوگی۔ مگر اس کی پابندی صرف اس صورت میں ہوسکتی ہے کہ کتاب ٹائپ میں چھپنے والی ہو۔ کتابت کی صورت میں یہ طریقہ مضر ثابت ہوگا۔

اگر حاشیہ میں اقتباس دیا جائے تو واوین '' '' میں ہو اور اس کے خاتمہ پر قوسین میں اس کا ماخذ بتا دیا جائے۔

اگر ایک صفحہ پر دو یا دو سے زیادہ حوالے ہوں تو ایک حوالہ کے نیچے دوسرا حوالہ دیا جائے، مسلسل نہ دیا جائے۔ لیکن اگر ایک ہی بیان یا دعوے کے دو یا اس سے زیادہ حوالے دینا ہو تو سب کو ایک قطار میں دینا چاہئے۔ بیچ بیچ میں سیمی کولن (؛) لگاتے جائیں۔

ثانوی ماخذ کی شکل میں پہلے اس ماخذ کا حوالہ دیا جائے جو محقق کے پیش نظر ہے اور پھر اصل ماخذ بتایا جائے۔ اصل ماخذ بتانے سے پہلے 'بحوالہ' یا 'منقول از' لکھ دیا جائے۔

حوالہ دینے کا کوئی مخصوص طریقہ یا اصول معین نہیں ہے، لیکن جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے اس کی پابندی شروع سے آخر تک کی جائے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب کسی کتاب کا پہلی بار حوالہ دیا جائے تو اس کی تھوڑی سی تفصیل دے دی جائے۔ مکمل تفصیل کتاب کے آخر میں کتابیات یا فہرست مآخذ کے تحت ہوگی۔ لیکن مضمون کی صورت میں مکمل تفصیل اسی موقع پر دینا ہوگی۔ مکمل حوالہ میں مندرجۂ ذیل اطلاعات کا ہونا ضروری ہے:

مصنف یا مرتب کا نام، کتاب کا نام، اڈیشن (اگر ہے)، مقامِ اشاعت، ناشر، سالِ اشاعت، جلد (اگر ہے)، باب (اگر ہے) صفحہ یا صفحات

ظاہر ہے کہ یہ حوالہ بہت طویل ہے اسلئے اسے مختصر کر کے اسطرح دیا جا سکتا ہے:

محمد حسین آزاد، آب حیات، طبع یازدہم، ص ۱۰۱

یا

محمد حسین آزاد، آب حیات، طبع یازدہم (لاہور، ۱۹۱۱ء)، ص ۱۰۱

پھر جب اسی کتاب کا حوالہ دینے کی ضرورت پیش آئے تو یوں دے سکتے ہیں:

محمد حسین آزاد، آب حیات، ص ۲۰۸

یا

محمد حسین آزاد، کتاب مذکور، ص ۲۰۸

اگر فوراً اسی مصنف اور اسی کتاب کا حوالہ دینا ہو تو وہ حسب ذیل ہوگا:

ایضاً، ص ۲۱۵

اور اگر صفحہ بھی وہی ہو تو حوالہ یوں ہوگا:

ایضاً

جو کتاب دو یا دو سے زیادہ جلدوں میں ہو اسکے حوالہ میں جلد کا نمبر دینا ضروری ہے۔

مثلاً

ڈاکٹر محی الدین قادری زور، فہرست مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو، جلد دوم، ص ۴۴

اگر کتاب مختلف ابواب پر تقسیم ہے تو باب کا ذکر ضروری ہے۔ جیسے

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، بار دوم، تیرہواں باب، ص ۲۷۱

اگر کسی کتاب کا صرف ایک ہی باب یا مضمون موضوع تحقیق سے متعلق ہے تو اس کا حوالہ اس طرح دیا جائے کہ مصنف یا مرتب کے نام کے بعد پہلے باب یا مضمون کا عنوان واوین میں لکھا جائے اور پھر کتاب کا نام اور صفحہ کا نمبر۔ جیسے

پنڈت برج نرائن چکبست، ''اودھ پنچ''، مضامین چکبست، ص ۲۳۵

مرتبہ کتاب کا حوالہ:

عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی، تذکرۂ میخانہ، مرتبہ محمد شفیع، ص ۴۵۰

مولوی مہیش پرشاد، مرتبہ، خطوط غالب، ص ۱۱۸

کسی کتاب کے مقدمہ کا حوالہ:

بیگم مہدی حسن، مرتبہ، مکاتیب مہدی، مقدمہ از (مولانا) سید سلیمان ندوی، ص ۵

جس کتاب پر مصنف یا مرتب کا نام نہ ہو:

علی گڑھ تاریخ ادب اردو، ص ۲۲۴

کلاسکی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے مصنف کا نام دینا ضروری نہیں۔ مثلاً باغ و بہار، جامعہ اڈیشن، سیر پہلے درویش کی، ص ۳۴

انسائکلو پیڈیا کے مضمون کا حوالہ:

عبدالمجید سالک، ''آزاد''، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۱، ص ۱۱۲

لغت کا حوالہ:

سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد دوم

لغت کے حوالہ میں صفحہ کا نمبر بتانے کی ضرورت نہیں۔

روئداد:

انجمن اسلام، سالانہ رپورٹ انجمن اسلام، بمبئی، بابت ۴۱-۱۹۴۰ء، ص ۳۵

خطوط، انٹرویو، سوالنامہ وغیرہ:

سید مسعود حسن رضوی (لکھنؤ) مکتوب بنام مولف (مرتب، مضمون نگار)، مؤرخہ یکم جون ۱۹۶۰ء

ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ذاتی انٹرویو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد، ۶ جولائی ۱۹۶۵ء

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی) بجواب سوالنامہ مرتبہ مؤلف (مرتب، راقم مضمون)

اگر کسی کتاب کا حوالہ بار بار دینا پڑے تو ہر بار اس کا نام لکھنے کے بدلے 'کتاب مذکور' لکھا جا سکتا ہے، بشرطیکہ پڑھنے والے کے لئے کسی الجھن یا غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان نہ ہو۔ مثلاً ایک مصنف کی دو یا دو سے زیادہ کتابوں کے حوالہ کی صورت میں ''کتاب مذکور'' کا استعمال اس کے لئے الجھن کا باعث ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں ہر بار کتاب کا نام لکھنا بہتر ہوگا۔

رسالہ کے مضمون کا حوالہ کتاب کے حوالہ سے کسی قدر مختلف ہوگا۔ اس کے مختلف اجزا حسب ذیل ہوں گے:

مضمون نگار، عنوان مضمون (واوین میں)، رسالہ کا نام، جلد اور شمارہ (بریکٹ میں سال دے دینا بھی مناسب ہوگا)، صفحہ

مثلاً

نصیرالدین ہاشمی، ''دکھنی مرثیوں کا ایک نایاب مجموعہ''، نوائے ادب، جلد ۱۰، شمارہ ۴ (۱۹۵۹ء)، ص ۱۶

اسی مضمون کا دوسری بار حوالہ:

نصیرالدین ہاشمی، ''دکھنی مرثیوں کا ایک نایاب مجموعہ''، ص ۱۸

اگر فوراً اسی مضمون کا حوالہ دینے کی ضرورت پڑے تو یوں دے سکتے ہیں:

ایضاً، ص ۲۲

اور اگر صفحہ بھی وہی ہو تو حوالہ یوں ہوگا:

ایضاً

ان مثالوں کی روشنی میں محقق نئے نئے حوالے خود بنا سکتا ہے۔

پی ایچ ڈی کا مقالہ:

پی ایچ ڈی کا مقالہ 11x8½ سائز کے عمدہ کاغذ پر لکھا یا ٹائپ کرایا جائے۔ دائیں طرف ڈیڑھ انچ کا اور بائیں طرف ایک انچ کا حاشیہ چھوڑا جائے۔ اوپر 1¼ اور 1½ انچ کا حاشیہ ہونا چاہئے۔ ہر صفحہ پر نمبر دیا جائے۔ نمبر صفحہ کے سرے پر چاہے بیچ میں ہو چاہے بائیں طرف۔ مقالہ سے پہلے دیباچہ، فہرست وغیرہ کے نمبر لفظ میں دئے جائیں۔ مقالہ کے خاتمہ پر ضمیمہ، کتابیات وغیرہ کے نمبر مقالہ کے صفحات کے نمبر کے ساتھ مسلسل ہوں۔ لکھنے والے کا خط اچھا ہو۔ کاربن پیپر سیاہ رنگ اور عمدہ قسم کا استعمال کیا جائے۔

مسودہ (خواہ تالیف ہو یا پی ایچ ڈی کا مقالہ) مکمل ہونے کے بعد مقالہ کی حسب

ذیل شکل ہوگی:

۱۔ ٹائٹل کا صفحہ: کتاب کا نام واضح اور دلکش مگر مختصر ہو۔ مبہم یا طویل نام سے بچنا چاہئے۔ اگر پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے تو اس پر مقالہ کا عنوان، طالب علم کا نام، ڈگری، یونیورسٹی کا نام اور مقالہ پیش کرنے کی تاریخ (مہینہ اور سال) درج ہوگی۔

۲۔ دیباچہ: جہاں تک ممکن ہو مختصر لکھا جائے۔ اس میں سبب تالیف یا نقطۂ نگاہ، اظہارِ ممنونیت وغیرہ ہو۔ (اگر کسی سے یا کچھ لوگوں سے غیر معمولی مدد ملی ہو تو اس کے لئے ''اظہارِ تشکر'' کے عنوان سے الگ صفحہ رکھا جاسکتا ہے۔) اظہارِ ممنونیت میں مبالغہ سے کام نہ لیا جائے۔ اپنے رہ نما اور کتب خانہ کے ناظم کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ محقق کی رہ نمائی یا مدد کرنا ان کے فرائض میں داخل ہے۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کا شکریہ ادا کرنا بھی غیر ضروری ہے۔

۳۔ فہرست مندرجات

۴۔ نقشوں، تصویروں وغیرہ کی فہرست

۵۔ مقالہ مختلف ابواب پر تقسیم ہوگا۔

۶۔ ضمیمہ: ایسا مواد جو متن کے لئے ضروری نہ ہو یا متن کے حسن کو مجروح کرتا ہو، لیکن جس سے مصنف کے بیان یا بیانات کی مزید تائید ہوتی ہو، کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر دیا جائے۔ بعض اوقات کتاب کی طباعت کے دوران میں مفید مواد حاصل ہوتا ہے۔ اسے بھی ضمیمہ کے طور پر شامل کیا جائے۔ مقالہ یا کتاب کے مختلف پہلوؤں کی مناسبت سے ایک سے زیادہ ضمیمے ہوسکتے ہیں۔ نقشے، ڈائیگرام وغیرہ بھی ضمیمے کے طور پر دئے جاسکتے ہیں۔

۷۔ کتابیات یا فہرست مآخذ

۸۔ اشاریہ (پی ایچ ڈی کے مقالہ میں اس کی ضرورت نہیں۔)

کتابیات یا فہرست مآخذ:

کتاب یا مقالہ کے خاتمہ پر مآخذ کی فہرست دینا آج کل کا عام دستور ہے۔ اس

فہرست سے قاری کو کتاب کے مآخذ معلوم ہونے کے علاوہ مواد کے استناد، اہمیت وافادیت وغیرہ کا اندازہ ایک جھلک میں ہوجاتا ہے۔ کتابیات محض کتابوں کے زیادہ سے زیادہ نام گنانے کے لئے نہ ہو۔ جو کتاب بھی ہو براہ راست موضوع سے تعلق رکھتی ہو اور اس سے مصنف یا مقالہ نگار نے اپنی تصنیف یا مقالہ میں استفادہ کیا ہو۔ ایک کتاب موضوع سے متعلق تو ہے لیکن گھٹیا قسم کی ہے اور مقالہ نگار یا مصنف کو اس سے کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوئی، ایسی کتاب کا نام فہرست میں شامل کرنے کی ضرورت نہیں۔ فہرست مآخذ منتخب ہونا چاہئے۔

کتابیات تیار کرنے میں وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو نوٹ لینے میں اختیار کیا گیا تھا، یعنی تراشے پر مصنف کا نام، کتاب کا نام اور دوسری ضروری معلومات نوٹ کی جائیں تاکہ انھیں حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دینے میں سہولت ہو۔ کتابیات کا کارڈ عموماً 3x5 سائز کا ہوتا ہے۔

کتابیات پیش کرنے میں اگر چند موٹی موٹی باتوں کا خیال رکھا جائے تو بہتر ہے۔ مثلاً مخطوطات کی فہرست مطبوعات کی فہرست سے الگ ہو۔ اسی طرح رسائل وجرائد بھی مطبوعات سے الگ رکھے جائیں۔ سب سے آخر میں ذاتی خطوط، سوالنامے وغیرہ ہوں۔ اس طرح فہرست مآخذ (کتابیات) چار حصوں پر تقسیم ہوتی ہے:

۱۔ مخطوطات

۲۔ مطبوعہ

۳۔ رسائل وجرائد واخبارات

۴۔ ذاتی خطوط، سوالنامے وغیرہ

اگر فہرست مختصر ہے تو اسے مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں۔

مخطوطات ومطبوعات کی فہرست مصنف وار حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دی جائے۔ مخطوطہ کی شکل میں اس لائبریری کا نام اور پتا بتانا بھی ضروری ہے جس میں وہ مخطوطہ محفوظ ہے۔ مثلاً

سعادت ناصر خاں، تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا، کتب خانۂ لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

اگر سنہ کتابت نسخہ پر درج ہو تو وہ ضرور دیا جائے۔

اگر مخطوطہ مصنف کا ذاتی نسخہ ہے یا کسی اور فرد کی ملکیت ہے تو اس کا مختصر سا تعارف کرا دینا مناسب ہوگا۔

اگر مطبوعات کی فہرست طویل ہے اور کتابیں مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں تو انھیں موضوع کے اعتبار سے تقسیم کر دینا بہتر ہوگا۔ اسی طرح اگر کتابیں مختلف زبانوں میں ہیں تو انھیں زبان کے لحاظ سے تقسیم کر دینا مناسب ہوگا۔ ہر کتاب کے لئے مندرجۂ ذیل اطلاعات کا بہم پہنچانا ضروری ہے۔

مصنف یا مرتب کا نام، کتاب کا نام، اڈیشن (اگر ہے)، مقامِ اشاعت، ناشر (اگر کتاب پر ناشر کا نام نہیں ہے تو مطبع کا نام)، سالِ اشاعت

مصنف یا مرتب کے نام لکھنے کا طریقہ اس طریقہ سے الگ ہوگا جو حوالہ میں استعمال کیا گیا ہے۔ اگر اس کا کوئی تخلص ہے تو پہلے تخلص لکھا جائے گا اور پھر نام۔ یا اگر اس کے نام سے پہلے ڈاکٹر یا مولوی یا اس قسم کا کوئی اور لفظ ہے تو پہلے نام ہوگا اور پھر وہ لفظ۔ اسطرح کتابیات اس نہج پر تیار کی جا سکتی ہے:

تصنیف:

اختر جوناگڑھی، قاضی احمد میاں، اقبالیات کا جائزہ، کراچی، اقبال اکیڈمی، ۱۹۵۵ء

نور الٰہی و محمد عمر، ناٹک ساگر، لاہور، شیخ مبارک علی تاجر کتب، ۱۹۲۴ء

مرتبہ کتاب:

قاسم، میر قدرت اللہ، مجموعۂ نغز مرتبہ محمود شیرانی، لاہور: کریمی پریس، ۱۹۳۳ء

یا

محمود شیرانی، مرتبہ، مجموعۂ نغز مصنفہ میر قدرت اللہ قاسم، لاہور، کریمی پریس، ۱۹۳۳ء

انتخاب:

کول، پنڈت کشن پرشاد، گلدستۂ پنچ، لکھنؤ، ہندوستانی پریس، ۱۹۱۵ء

میر، میر تقی میر، انتخاب کلام میر، منتخبہ مع مقدمہ از مولوی عبدالحق، پانچواں اڈیشن، دہلی، انجمن ترقیٔ اردو ہند، ۱۹۴۵ء

یا

عبدالحق، مولوی، منتخبہ مع مقدمہ، انتخاب کلام میر، پانچواں اڈیشن، دہلی: انجمن ترقیٔ اردو ہند، ۱۹۴۵ء

ترجمہ:

یوسف کوکن، محمد، مترجمہ، مختصر تاریخ ہند مصنفہ ڈبل، اچ، مورلینڈ، مدراس، مدراس یونیورسٹی، ۱۹۵۲ء

جس کتاب پر مرتب یا مصنف کا نام نہ ہو:

نوائے آزادی، بمبئی: ادبی پبلشرز، ۱۹۵۷ء

اگر دیباچہ یا کسی اور مستند ذریعہ سے مصنف یا مرتب کا پتا چل سکتا ہو تو اسے بریکٹ ( ) میں دے دینا چاہئے۔ مثلاً

(عبدالماجد دریابادی، مولانا)، زود پشیماں، لکھنؤ، الناظر پریس، ۱۹۱۷ء

مخصوص ایڈیشن یا مجموعہ:

حالی، خواجہ الطاف حسین، مسدس حالی، صدی اڈیشن، مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین، دہلی: حالی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۳۵ء

عبداللہ، ڈاکٹر سید، مرتبہ، ارمغانِ علمی، لاہور: مجلس ارمغان علمی، ۱۹۵۵ء

پبلک رپورٹ:

مہدی علی خاں، نواب محسن الملک مولوی سید، روئداد محمڈن انگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ: مطبع احمدی، ۱۹۰۳ء

انسائیکلو پیڈیا، لغت وغیرہ:

اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۴، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۵۹ء
نیر، نورالحسن، نوراللغات، جلد ۴، لکھنؤ: اشاعت العلوم پریس، ۱۹۳۱ء

غیر مطبوعہ مقالہ:

ڈاکٹر میمونہ دلوی، بمبئی میں اردو، پی ایچ ڈی کا غیر مطبوعہ مقالہ، بمبئی یونیورسٹی، ۱۹۶۱ء

رسالہ واخبار:

اورینٹل کالج میگزین، لاہور، جلد ۲۴، (۴۸-۱۹۴۷ء)
معارف، اعظم گڑھ، جلد ۱۹ (۱۹۲۶ء)
اودھ اخبار، لکھنؤ، جلد ۳۷ (۱۸۹۵ء)

ذاتی خطوط، سوالنامہ وغیرہ:

مہر، مولانا غلام رسول، لاہور، مکتوب (مکاتیب) بنام مؤلف (مرتب، مضمون نگار) مؤرخہ یکم ستمبر ۱۹۵۷ء
صدیقی، ڈاکٹر عبدالستار، الہ آباد، جواب سوالنامہ مرتبہ مؤلف (مرتب، راقم مضمون)

اشاریہ:

کتابیات کی طرح اشاریہ بھی علمی و تحقیقی کتابوں میں لازمی طور پر ہونا چاہئے۔ اس کی وجہ سے محقق کو فوراً پتا چل جاتا ہے کہ کتاب میں اس کے کام کی چیز یا چیزیں ہیں یا نہیں۔ اس طرح وہ پوری کتاب کی ورق گردانی سے بچ جاتا ہے۔ اشاریہ کا مقصد اشخاص، مقامات وغیرہ کے نام بتانا نہیں ہے بلکہ ان سے متعلق کتاب میں کوئی اطلاع یا اطلاعات بہم پہنچائی گئی ہوں۔ اگر کتاب ضخیم ہے تو اشاریہ کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اشخاص کے نام
۲۔ مقامات کے نام

۳۔ کتابوں کے نام

اشاریہ کا انحصار دراصل موضوع یا مضمون کتاب پر ہے۔ مثلاً کتاب باغبانی کے موضوع پر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں پودوں اور پھولوں کا ذکر کثرت سے ہوگا۔ اس لئے ان کا اشاریہ بنانا ہوگا۔ کتاب میں پرندوں کا ذکر کثرت سے ہوا ہے تو ان کا بھی اشاریہ بنایا جائے۔ تاریخ کی کتاب میں اہم واقعات کا بھی اشاریہ ہوگا۔ مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ اشاریہ کتاب کے متن کے مطابق ہونا چاہئے، یعنی جن جن چیزوں کا ذکر زیادہ ہوا ہے ان کا اشاریہ بنایا جائے۔

موجودہ دور میں اشاریہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اور یہ ہے بھی حقیقتاً نہایت مفید اور کام کی چیز۔ اس سے عام قاری کو بھی فائدہ پہنچتا ہے اور تحقیق کرنے والے کو بھی، خصوصاً نئے محقق کو۔ اس کے ذریعہ اس کی رہ نمائی بھی ہوتی ہے اور وقت بھی بچتا ہے۔ اسلئے اشاریہ محنت اور دلچسپی سے تیار کرنا چاہئے اور جتنے اہم موضوع کتاب میں ہوں سب کا اشاریہ بنانا چاہئے۔

☆☆☆

باب-۶

تحقیق وتصحیح متن

تحقیق کی ایک شاخ کسی مخطوطہ کی تصحیح وترتیب ہے۔اس کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کسی موضوع پر مقالہ لکھنے کی، بلکہ بعض حالات میں اس کی اہمیت مقالہ سے بڑھ جاتی ہے۔ بظاہر یہ کام آسان نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً خاصہ دقت طلب اور دشوار ہے اور اس میں متعدد کٹھن منزلیں آتی ہیں۔شاید اسی لئے بعص لوگ اسے مرض خیال کرتے ہیں۔مگر یہ نہ مرض ہے اور نہ سائنس۔ان محققوں کے سامنے جن کی تحقیق کا انحصار مخطوطات پر ہوتا ہے، چند مسائل آتے ہیں۔انھیں حل کرنے میں عقل سلیم کے استعمال کا نام متن کی تصحیح وترتیب ہے۔[۱]

کسی مخطوطہ کو مرتب کرنے کا مقصد محض ایک کتاب کو گمنامی سے نکال کر شائع کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد مصنف کے اصل افکار، اندازِ تحریر اور زبان تک پہنچنا ہے، یعنی ایک صحیح نسخہ تیار کرنا ہے۔اسی لئے Postgate نے متن کی تصحیح کو انسانی ذہن کی باقاعدہ اور ماہرانہ مشق کہا ہے۔[۲]

نسخے یا مخطوطے عموماً تین قسم کے ہوتے ہیں: (۱) خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا یا

---

[۱] A componsen to Classical Sutdies, F. W. Hall۔، دیباچہ، ص ۴

[۲] Introduction to Indian Textual Criticism, S. M. Katre۔، باب ۱، ص ۸

مصنف کی فرمائش سے لکھا اور مصنف کا تصحیح کیا ہوا نسخہ۔ (۲) مصنف کے زمانہ کے بعد کے نسخے جو مصنف کے نسخے سے نقل کئے گئے۔ (۳) ان نقلوں کی نقلیں۔

تحقیق و تصحیح کا کام دراصل اسی آخری شق کے نسخوں کے سلسلہ میں ہے کیوں کہ نقل سے نقل کرنے میں غلطیوں کے راہ پانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ بھی غلطیوں سے پاک نہیں ہوسکتا اور اگر نشان دہی کی جائے تو اس کو ان کے تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا۔ (۲) لکھنے میں الفاظ چھوٹ جاتے ہیں، مکرر لکھ جاتے ہیں، اور کبھی کبھی غلط بھی تحریر ہو جاتے ہیں۔ مگر غلطیوں کے باوجود مصنف کے خود نوشتہ نسخہ کی اہمیت مسلم ہے۔ اسکی موجودگی سے کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اس کی عدم موجودگی کی صورت میں اس سے قریب ترین نسخہ کو معتبر ماننا ہوگا۔ بعض اوقات کسی کتاب کا صرف ایک ہی نسخہ موجود یا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تصحیح و ترتیب کا کام خصوصاً مشکل ہے۔

تحقیق متن کی دشواریاں:

اردو میں عربی رسم خط کی بنا پر تحقیق و تصحیح متن کا کام نسبتاً زیادہ دشوار ہے۔ ان دشواریوں کا تجزیہ ایک محقق نے خوبی سے کیا ہے۔ اسے اختصار کے ساتھ نیچے نقل کیا جاتا ہے:

۱۔ اس رسم خط میں نقطے دار حرفوں کی تعداد زیادہ ہے یا یوں کہئے کہ نقطوں سے حرفوں کی مزید شکلیں معین ہوئی ہیں۔ اردو میں ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ کی قدیمی شکلیں نقطوں کے اضافے سے ظاہر ہوتی تھیں۔

۲۔ ایک سے زیادہ نقطے ہونے اور نقطے دار حرفوں کے پے در پے آنے سے تحقیق متن کا مسئلہ دشوار ہو جاتا ہے۔

۳۔ نقطوں کو ملا کر لکھنے سے نقطوں کا تقدم و تاخر مشکل اور پھر لفظوں کا تعین دشوار ہو جاتا ہے۔

۴۔ اگر حروف الگ الگ ہوں تو نقطوں سے اتنی دشواری نہ ہو لیکن جب پورے حروف کی نشان دہی صرف شوشے اور ان پر کے نقطے کرتے

ہوں اور نقطوں کا باقاعدہ اہتمام نہ ہوتا ہو تو پھر لفظوں کے تعین میں کیا کیا قباحتیں نہ پیدا ہوتی ہوں گی، اور شکستہ تحریر میں نہ نقطوں کا التزام ہوتا ہے اور نہ شوشوں اور مفرد حرفوں کی شکل باقی رکھی جاتی ہے تو پھر قیاس ہی کی بنا پر سارا فیصلہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک عالم کے قیاس پر سو فی صدی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تو ایک کاتب جس نے کسی شکستہ تحریر کی نقل کی ہو، اس کے قیاس پر کیوں کر اعتماد کیا جائے۔

۵۔ حرفوں کے اختصار یعنی شوشوں اور تشدید کے لفظ کے املا میں جگہ نہ پانے کی بنا پر ہجاؤں (Syllables) کا تعین عام طور پر دشوار ہو جاتا ہے۔

۶۔ بسا اوقات جملے کے بعض لفظوں کو ایک خاص انداز میں پڑھنے سے نئے معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔ فارسی اور اردو میں استفہام اقراری اور انکاری کو مثال میں پیش کر سکتے ہیں' خوب آئے' کہہ کر' نہیں آئے' مراد لینے یا' نہیں جاؤ گے' سے معنی مثبت پیدا کرنے کے لئے کوئی مخصوص علامت نہیں ہے۔

۷۔ حرفوں کی صوری اور صوتی یکسانی التباس کا سبب بن جاتی ہے۔ و، د، ذ، ز وغیرہ کا التباس اتنا عام ہے کہ ایک ایک لفظ کی تین تین، چار چار املائی شکلیں بن جاتی ہیں۔ ہ، ج، س، ش، ص، ٹ، ط، ت، ض، ظ، ز، ذ، ژ کی ایک دوسرے میں تبدیلی صوری اور صوتی یکسانی کا نتیجہ ہے۔

۸۔ ہماری زبان کے وہ حروف تہجی جو ایک دوسرے سے پیوست نہیں ہوتے، ان سے تعین متن میں دشواری پیدا ہوتی ہے۔ ایک لفظ کے آخری حرف دوسرے لفظ کے ابتدائی حرف متصور ہوتے ہیں۔ کبھی ایک ہی مفرد لفظ دو مفرد لفظ متصور ہونے لگتا ہے۔

۹۔ ہائے فارسی، جیم فارسی، زاے فارسی، کاف فارسی، مدتوں ب،

ج، ز ک کی شکل میں لکھے جاتے تھے۔ اس کی وجہ سے متن کی تحقیق میں دشواری ہوتی تھیں۔

۱۰۔ زیر، زبر، پیش (حرکات) کے لفظ کے املا میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے دو لفظوں کے درمیان صوری فرق بہت کم رہ جاتا ہے۔

۱۱۔ فارسی علامتِ اضافت جو اردو میں بھی رائج ہے اگر ہمیشہ لکھی جاتی یا املا میں شامل ہوتی تو متن کا تعین قدرے آسان ہو جاتا۔

۱۲۔ اردو رسم خط میں قدیم (زمانہ) میں ہائے مخلوط اور ہائے ہوز میں بہت کم فرق کیا جاتا تھا۔

۱۳۔ اردو کے قدیم رسم خط میں یائے معروف و مجہول کا املائی فرق نہ تھا، البتہ صوتی فرق تھا۔ اردو کا یہ (ایک) اہم مسئلہ ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ یائے معروف و مجہول کا تعلق براہ راست زبان سے ہے۔ اکثر یائے مجہول سے مذکر اور جمع اور یائے معروف سے مؤنث اور واحد کا کام لیا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں کی الگ الگ املائی شکلیں مقرر نہ تھیں۔ یائے معروف 'ے' کی شکل میں اور یائے مجہول 'ی' کی طرح بھی لکھی جاتیں۔''[1]

الحاق کلام:

قدیم متنوں میں جو تصرفات و تحریفات ہوتی تھیں ان کا ایک بڑا سبب ہمارے رسم خط کی مذکورہ بالا خصوصیتیں یا دقتیں تھیں۔ محقق کو ان خصوصیتوں پر غور کرنا اور انھیں سمجھنا ہوگا۔ کم سواد کاتب کی سہل انگاری اور اس کی 'اصلاحیں' بھی تحریفات کا باعث ہوتی تھیں۔ رسم خط کی خرابیوں اور املائی دقتوں کی وجہ سے لفظی تحریفات ہوتی تھیں، لیکن ان سے بڑھ کر تحریف ایک شاعر کے کلام میں دوسرے شاعر یا شاعروں کا کلام شامل کر لینا ہے۔ الحاق کلام کے مختلف اسباب ہوتے تھے جن میں سے مندرجۂ ذیل اہم ہیں:

---

[1] ۔ ڈاکٹر نذیر احمد ''تحقیق و تصحیح متن کے مسائل''، نقوش، لاہور، نمبر ۹۷، (۱۹۶۳ء)، ص ۷ تا ۱۰

''۱۔کبھی کبھی مختلف شاعروں کی ایک ہی زمین والی غزلوں اور ان کے متنوں میں خلط ملط ہوجاتا ہے۔

۲۔ایک ہی تخلص کے شاعروں کے کلام میں التباس عام ہے۔

۳۔ بیاضوں کے ولہ، منہ، ایضاً جیسی علامتوں کے غلط لگ جانے سے ایک شاعر کا کلام دوسرے کی طرف بآسانی منسوب ہوجاتا۔

۴۔ایک شاعر جو کسی حاص صنف میں اور کسی مخصوص طرز کے لئے مشہور ہوگیا تو اس کے مشابہ بہت سی چیزیں جو دوسروں کی ہوتی ہیں، وہ مخصوص شاعر کی طرف منسوب ہوجاتی ہیں۔

۵۔منتخب دیوانوں کا مجموعہ بھی بڑا التباس پیدا کرتا ہے۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ درمیان سے وہ ورق نکل جاتا ہے جس پر شاعر کا نام درج ہوتا ہے تو سارا کلام اس سے پہلے کے شاعر کے نام منسوب ہوجاتا ہے، خصوصاً ایسا کلام جس میں تخلص کم آتا ہے۔قصیدوں اور رباعیوں میں الحاق کی بڑی وجہ یہی ہے۔

۶۔کبھی کبھی باپ اور بیٹے کے کلام میں سہل انگاری کی بنا پر التباس ہوجاتا ہے اور یہ التباس بڑی غلط فہمی کا سبب بن جاتا ہے۔

۷۔کبھی کبھی محبوب ہستی کے مرتبے کے پیش نظر بعض دوسری کتابیں ان کی طرف منسوب کردی جاتی ہیں۔اس سلسلے میں یوسف زلیخائے فردوسی، بعض مثنویات عطار، دیوان خواجہ معین الدین چشتی بطور نمونہ 'مشتی از خرواری' پیش کئے جاسکتے ہیں۔''[۱]

محقق متن کی خصوصیات:

ان دقتوں کے پیش نظر تصحیح متن کے محقق میں ان خصوصیتوں کے علاوہ جن کا پہلے باب

---

[۱]۔ڈاکٹر نذیر احمد، مضمون مذکور، ص ۱۱، ۱۲

میں ذکر ہوا چند مزید اور مخصوص صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے۔ڈاکٹر نذیر احمد نے بجا طور پر مندرجۂ ذیل پانچ خصوصیتیں بتائی ہیں:

۱۔سب سے پہلے اور ضروری خصوصیت یہ ہے کہ محقق طرز املا و تاریخ خط سے واقف ہو کیونکہ اسکے بغیر وہ نسخوں کی قدامت کا تعین نہیں کرسکتا[۱]۔عموماً مخطوطہ کے آخر میں کاتب کا ترقیمہ ہوتا ہے جس سے یقین کے ساتھ اس کے زمانہ کا تعین ہوجاتا ہے۔لیکن ایسے مخطوطات کی بھی کمی نہیں جس میں ترقیمہ نہیں ہوتا۔اس صورت میں محقق کی طریق املا اور طرزِ خط سے واقفیت نسخہ کے زمانہ کے تعین میں اس کی مدد کرسکتی ہے۔طرزِ خط میں جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے اور طریق املا میں ضرورت کے لحاظ سے ہمیشہ تبدیلیاں ہوا کی ہیں۔اس لئے مختلف ادوار کے طرزِ خط اور طریق املا سے پوری واقفیت ہونا ضروری ہے۔

۲۔طرزِ خط سے پورے طور پر واقف ہونے کے لئے خطاطوں کے تذکرہ سے استفادہ ضروری ہے۔''قلمی نسخے کی قدر و قیمت کے تعین میں خطاطوں کے تذکروں سے مدد مل سکتی ہے۔''[۲]

۳۔طرزِ خط اور طریقِ املا سے واقفیت کے ساتھ ساتھ کاغذ اور روشنائی کی پہچان بھی محقق کے لئے ضروری ہے۔''کاغذ اور سیاہی متن کے متعلقہ امور ہیں جن سے واقفیت سے تحقیق میں مدد ملتی ہے۔...کاغذ و سیاہی کے مختلف اقسام کی واقفیت نسخے کی قدامت و اہمیت متعین کرنے میں بڑی مفید ہوتی ہے۔''[۳]

۴۔محقق متن کو عہد بعہد کی زبان سے واقف ہونا چاہئے۔زبان میں ہر دور میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔''اس بنا پر محقق متن کے لئے لازم ہے کہ وہ زبان کے ہر دور کی مخصوص خصوصیات کو جانتا ہوتا کہ مصنف کے دور کے تعین میں آسانی ہو۔''[۴]

۱۔ڈاکٹر نذیر احمد، مضمون مذکور، ص ۱۳

۲۔ایضاً، مضمون مذکور، ص ۱۶

۳۔ایضاً، ص ۱۵

۴۔ایضاً

۵۔شعری مخطوطہ کی تحقیق وتصحیح کے لئے محقق کا فن شاعری اور عروض سے پورے طور پر واقف ہونا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ ''قدیم متنوں کی تصحیح خاطر خواہ نہیں کرسکتا۔''[1]

نسخوں کی تلاش اور حصول:

متن کی تحقیق وتصحیح میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ محقق تمام موجودہ نسخوں کا جو مختلف کتب خانوں میں ہیں، پتا لگائے اور پھر ان کے حصول کی کوشش کرے۔اس سلسلہ میں کتب خانوں کے مطبوعہ کٹیلاگوں سے خصوصاً مدد مل سکتی ہے۔مختلف نسخوں کا پتا لگانے کے علاوہ کٹیلاگوں سے ان کے متعلق تھوڑی بہت معلومات بھی حاصل ہوجاتی ہیں۔محقق کا ہر نسخہ تک پہنچنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔لیکن موجودہ سائنسی دور میں ان کی مائیکرو فلم، روٹوگراف وغیرہ حاصل کئے جاسکتے ہیں۔نقلیں بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔نقل کی صورت میں غلطیوں کا احتمال ہے اس لئے اگر محقق خود یہ کام انجام دے سکتا تو بہتر ہے، ورنہ کسی ایسے شخص کے ذمہ کرے جس کی صلاحیت اور خلوص پر اسے اعتماد ہو۔

نسخوں کے مراتب:

مصر کے ایک ممتاز عالم نے عربی مخطوطات کے مختلف مراتب وضاحت اور عمدگی سے بتائے ہیں۔ان کا اطلاق بڑی حد تک اردو مخطوطات پر بھی ہوتا ہے۔ان کی رائے میں نسخوں کے مراتب بصورتِ ذیل قائم ہوں گے[2]:

۱۔سب سے بہتر قابلِ اشاعت نسخہ وہ ہوتا ہے جس کو مصنف نے خود لکھا ہو اور یہی اساسی نسخہ ہوگا۔

۲۔مصنف کے نسخہ میں حذف واضافہ کی صورت میں یہ معلوم کرنا ضروری ہوگا کہ کتاب کی تصنیف ایک وقت میں ہوئی یا چند مراحل میں طے ہوئی ہے۔اس طرح ہمیں یقین ہوجائے گا کہ نسخۂ زیر بحث مصنف کی کوشش کی آخری شکل ہے۔

---

[1] ۔ڈاکٹر نذیر احمد، مضمون مذکور، ص ۱۵

[2] ۔یہ مقالہ ضمیمے کی حیثیت سے اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔(دلوی)

۳۔مصنف کے نسخہ کے بعد وہ نسخہ زیادہ معتبر ہوگا جس کو مصنف نے خود پڑھا ہو یا اس کے سامنے پڑھا گیا ہو اور مصنف کے قلم نے اس کی تصدیق بھی کی ہو۔

۴۔اس کے بعد وہ نسخہ زیادہ وقیع ہوگا جو مصنف کے نسخہ سے نقل کیا گیا ہو یا پھر کسی ایسے ہی نسخہ سے معارضہ یا مقابلہ کیا گیا ہو۔

۵۔پھر وہ نسخہ معتبر ہوگا جو عہد مصنف میں نقل کیا گیا ہو اور علما نے اس کا مطالعہ یا سماعت کی ہو۔

۶۔پھر وہ نسخہ معتبر ہوگا جو مصنف کے عہد کے بعد نقل کیا گیا ہو اور اس پر علما کی سماعت کی تصدیق نہ ہو۔

۷۔ایسے نسخے جو مصنف کے زمانۂ حیات کے بعد نقل کئے گئے ہوں، ان میں زمانہ کے لحاظ سے اولیت اور افضلیت ہوگی اور وہ نسخہ زیادہ اہم ہوگا جس کو کسی عالم نے نقل کیا ہو یا کسی عالم کے سامنے اس کی قرأت کی گئی ہو۔

اختلاف کی صورت میں ہم متأخر، صحیح اور منضبط نسخہ کا مقابلہ کر کے دیکھیں گے کہ اگر وہ قدیم ترین نسخہ سے تصحیف وتحریف کے لحاظ سے بہتر ہے تو اسی کو اختیار کریں گے، یا ایسا نسخہ ہے جو بالکل متأخر ہے مگر خطاطی کا عمدہ نمونہ ہے اور مصنف کے نسخہ سے براہ راست یا اسکے ہم عصر نسخہ سے منقول ہے یا اس کے علاوہ دیگر خصوصیات کا حامل ہے تو یہی مرجح ہوگا۔[1]

مختلف نسخوں کے علاوہ تحقیق وتصحیح متن کے سلسلہ میں چند اور چیزیں بھی مفید ومعاون ثابت ہوتی ہیں، مثلاً شعرا کے تذکرے، بیاضیں، اس عہد کی تاریخیں، صوفیاء کرام کے ملفوظات، ادیبوں، شاعروں اور صوفیوں کے مکاتیب، لغات وقواعد وغیرہ۔[2]

---

[1] ۔ڈاکٹر صلاح الدین المنجد، ''تحقیق متن کے اصول''، مترجمہ محمد فضل الرحمن ندوی، فکر ونظر، علی گڑھ، جلد ۲، نمبر ۲، (۱۹۶۱ء)، ص ۸۷، ۸۸

[2] ۔ڈاکٹر نذیر احمد، مضمون مذکور، ص ۱۶ تا ۱۸

متن کی تحقیق وتصحیح:

تمام ممکن الحصول نسخوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ وموازنہ کر کے محقق چند قابل اعتماد نسخوں کا انتخاب کرے تا کہ ایک صحیح متن تیار کیا جا سکے۔ ہر نسخہ کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ گہرے اور مسلسل مطالعہ سے ان خصوصیات کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔ ان خصوصیات کا پتا لگانا اور انھیں سمجھنا تحقیق وتصحیح متن کا ایک لازمی جز ہے۔ اصول یہ ہے کہ فیصلہ صادر کرنے سے پہلے تمام قابل اعتماد گواہوں کے بیانات سننا اور مسلسل سننا چاہئے۔[1]

تمام حاصل شدہ نسخوں کا مطالعہ ومقابلہ کر لینے کے بعد ایک نیا اور صحیح نسخہ مرتب ہوگا۔ اس اصول پر صرف مغرب کے فضلا کا عمل نہیں ہے بلکہ مشرق کے علما نے بھی اسے قبول کر لیا ہے۔ مجمع علمیٔ عربی (دمشق) نے عرصہ ہوا مخطوطات کی اشاعت کے لئے علما وفضلا کی ایک جماعت کو وضع اصول کی دعوت دی تھی۔ اس مجلس نے جو چند اصول وضع کئے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ کتاب کی تحقیق کا مقصد یہ ہے کہ صحیح متن پیش کیا جائے۔ اسلئے ناگزیر ہے کہ اختلافات کی روایات کی طرف پورا پورا دھیان ہو اور وہ عبارت داخل متن ہو جو صحیح تصور کی جائے۔[2] روایتوں کا اختلاف بہر حال حاشیہ میں بتانا ہوگا۔ دو یا دو سے زاید نسخوں کی صورت میں کسی ایک کو بنیاد بنانا ہوگا۔ اگر مصنف کا خود نوشتہ نسخہ قبضہ میں ہے تو وہی بنیاد ہوگا۔ دوسرے نسخوں سے بنیادی نسخہ کا مقابلہ اور اس کی غلطیوں کی تصحیح کرنا ہوگی۔ اگر کسی نسخہ میں کوئی ایسا اضافہ ہے جو معتمد علیہ نسخہ سے ساقط ہے تو یہ اضافہ اصل متن میں شامل ہوگا اور حاشیہ میں اسکا ذکر کر دیا جائے گا۔ یہ صرف اس صورت میں ہوگا جب کہ مصنف کا اضافہ ثابت ہو نہ کہ ناسخ کا۔ ناسخ کا اضافہ حاشیہ میں درج ہوگا۔[3] لیکن کسی ایک مخطوطہ کو خواہ وہ کتنا ہی قدیم اور قابل اعتماد کیوں نہ ہو، پورے طور پر بنیاد بنا لینا اور اس کے تمام مندرجات کو صحیح تسلیم کر لینا خطرہ سے خالی نہیں۔ اگر کچھ نہیں تو سہو قلم کا امکان تو بہر حال ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ مختلف مستند

---

[1] S. M. katre۔ کتاب مذکور، باب ۴، ص ۳۶

[2] ڈاکٹر صلاح الدین المنجد، مضمون مذکور، ص ۸۴

[3] ایضاً، ص ۹۰

مخطوطات میں سے وہ متن قبول کیا جائے جو زبان اور اسلوب بیان کے اعتبار سے مصنف یا شاعر کے عہد اور پھر خود مصنف یا شاعر کی زبان اور اسلوبِ بیان سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو۔ مثلاً انشا کا ایک شعر ہے:

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ زور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

دوسرے مصرع میں عموماً 'اور' (بجائے 'زور') پڑھا جاتا ہے۔ یہ جاننے کے بعد کہ انشا کے عہد میں لفظ 'زور' (عجیب کے معنی میں) استعمال ہوتا تھا، محقق یہ غلطی نہیں کرے گا۔

مصنف کے سہو قلم، کاتب کی دانستہ و نادانستہ اصلاحوں، نقل در نقل کی غلطیوں کے علاوہ مسودہ پر زمانہ کا بھی اثر پڑتا ہے۔ موسم کے اثر سے کاغذ میں نمی آجاتی ہے۔ بعض اوقات لفظ اڑ جاتے ہیں۔ مخطوطوں اور کتابوں کے ازلی دشمن، دیمک اور بعض دوسرے کیڑے حرفوں کو چاٹ جاتے ہیں۔ اس کمی کو دوسرے مستند نسخوں کی مدد سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر اتفاق سے زیر تحقیق کتاب کا ایک ہی نسخہ ہے اور اس کمی کو پورا کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو ان لفظوں کی جگہ نقطے لگا دینا چاہئے اور حاشیہ میں اس کی توضیح کر دینا چاہئے۔ قیاساً ان کی جگہ پر کچھ نہ لکھا جائے۔

اگر مصنف نے کسی دوسرے مصنف یا مصنفوں کی عبارتوں کے اقتباسات دئے ہیں یا کسی شاعر یا شاعروں کے اشعار نقل کئے ہیں تو ان کا مقابلہ اصل سے کرنا ضروری ہے تاکہ ان کی صحت کا یقین ہوجائے۔ حاشیہ میں ان کے مآخذ بتا دینا بھی مناسب ہوگا۔ اگر مصنف نے عبارت کا کچھ حصہ حذف کیا ہے تو وہ بھی بتانا ہوگا۔

متن میں بعض اوقات کسی لفظ یا فقرہ یا جملہ یا پیراگراف یا شعر یا اشعار کا اضافہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ اضافے تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک اساسی نسخہ کے علاوہ کسی اور نسخہ کا، اور دوسرا کسی دوسرے ماخذ سے لیا ہوا ہوتا ہے۔ تیسرا اضافہ وہ ہے جو خود محقق سیاق و سباق کلام کے لحاظ سے کرتا ہے۔ ان اضافوں کے ظاہر کرنے کے لئے اردو میں ابھی تک علامتیں معین نہیں ہوئی ہیں۔ اسلئے مندرجۂ ذیل علامتوں کو رائج کیا جاسکتا ہے۔

< > : پہلی دو قسم کے اضافے مکسور قوسین میں رکھے جائیں اور حاشیہ میں ان کی وضاحت کردی جائے۔

[ ] : تیسری قسم کا اضافہ مربع قوسین میں ہو۔ حاشیہ میں اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

اگر متن کے کسی لفظ کی تحقیق ناممکن ہو تو قیاساً اس کی تصحیح نہ کی جائے بلکہ اس کے آگے قوسین میں (کذا) لکھ دیا جائے۔ تحقیق متن میں مشکوک الفاظ کی درستی کی جاسکتی ہے لیکن اصلاح نہیں کی جاسکتی۔ محقق کو اس سے بحث نہیں کہ صحیح کیا ہے۔ اسے صرف یہ دیکھنا ہے کہ مصنف یا شاعر کے عہد کے مطابق کیا ہونا چاہئے۔

متن تیار کرتے وقت املا کا خیال رکھنا ضروری ہے، یعنی املا وہی ہوگا جو اس عہد میں رائج تھا۔ مثلاً عہدِ سودا و میر میں بہت کو 'بہوت' یا دونوں کو 'دونو' لکھتے تھے۔ اگر میر یا سودا یا اس عہد کے کسی دوسرے شاعر کے کسی شعر میں 'بہت' یا 'دونوں' لکھا جائے تو یہ متن کی تصحیح نہیں بلکہ تغلیط ہوگی۔ میرزا فرحت اللہ بیگ نے 'دیوانِ یقین' کو مرتب کیا جو انجمن ترقیٔ اردو، ہند کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں انھوں نے یقین کے عہد کے طریقِ املا کی پابندی کرنے کے بدلے بالقصد موجودہ طرزِ املا کی پابندی کی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دیوانِ مذکور موجودہ دور کی کتاب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن رسم تحریر میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ مثلاً قدیم زمانہ میں ٹ، ڈ وغیرہ پر تین یا چار نقطے لگائے جاتے تھے۔ اب تحقیق شدہ متن میں ان پر نقطے لگانے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح قدیم زمانہ میں اکثر دو لفظ ملا کر لکھتے تھے، جیسے پلپل (پل پل)، آنکھونمیں (آنکھوں میں) وغیرہ۔ انھیں موجودہ طریقہ کے مطابق الگ الگ لکھنا چاہئے۔ قدیم اور خصوصاً متروک الفاظ پر اعراب لگا دینا چاہئے تاکہ انکے تلفظ میں غلطی نہ ہو۔

پرانی نثری کتابیں موجودہ طریقہ پر ابواب پر تقسیم نہیں ہوتی تھیں بلکہ فصول پر منقسم ہوتی تھیں اور لکھنے کا انداز یہ تھا کہ عموماً بسم اللہ سے شروع ہوکر 'تمت' ہی پر قلم رکتا تھا۔ فصل کا لفظ، اور اگر اسکا عنوان ہوا تو وہ سرخ روشنائی سے متن کے ساتھ لکھا جاتا تھا۔ چوں کہ کتاب

کو جدید طرز پر مرتب کیا جارہا ہے اسلئے اسے ابواب پر تقسیم کرنا ہوگا۔لیکن مصنف کی ترتیب و تقسیم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ ابواب کے مسلسل نمبر ہوں گے۔ ہر باب کی ابتدا نئے صفحہ سے ہوگی۔ ابواب کا عنوان جلی قلم سے صفحہ کے وسط میں لکھا جائے گا۔اگر مصنف نے عنوان قائم کیا ہے تو اسے بدلا نہیں جائے گا، اور اگر اس نے عنوان قائم نہیں کیا ہے تو محقق کو عنوان قائم کرنا ہوگا۔ محقق کا قائم کیا ہوا عنوان مربع قوسین [ ] میں ہوگا۔اسے ذیلی سرخیاں بھی قائم کرنا ہوں گی۔ یہ سرخیاں متن کے قلم سے سطر کے ساتھ پیراگراف کی شکل میں لکھی جائیں گی اور باب کے عنوان کی طرح مربع قوسین میں ہوں گی۔ ہر باب کی عبارت کو پیراگرافوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔اگر زیر تحقیق کتاب مختلف اصناف پر مشتمل شعری مجموعہ ہے تو ہر صنف کی ابتدا نئے صفحہ سے ہوگی اور اس کی سرخی جلی قلم سے صفحہ کے وسط میں لکھی جائے گی۔خود نظم کی سرخی اس سے خفی تر قلم سے تحریر ہوگی۔ مسلسل نظم (مثلاً مثنوی، قصیدہ وغیرہ) کی صورت میں اشعار کے اعداد پانچ پانچ یا دس دس کے وقفہ سے بتائے جائیں۔

اختلاف نسخ میں ہر اختلاف کا بتانا ضروری نہیں بلکہ صرف اہم اختلافات بتائے جائیں۔اختلافات بتانے کے دو طریقے ہیں۔ایک طریقہ یہ ہے کہ متن ہی کے صفحہ پر حاشیہ میں بتائے جائیں، اور دوسرا یہ کہ کتاب کے آخر میں مسلسل نمبروں کے ساتھ درج کئے جائیں۔ دوسرے طریقہ میں طباعت میں سہولت ہوتی ہے، لیکن پہلے طریقہ سے مطالعہ میں آسانی ہوتی ہے۔اسی لئے عموماً اسے ترجیح دی جاتی ہے۔

مقدمہ یا تعارف:

متن پیش کرنے سے پہلے محقق، تصنیف اور اس کے مصنف کے متعلق ضروری اطلاعات بہم پہنچائے۔ایسی عبارت یا تحریر کا عنوان عموماً 'مقدمہ' ہوتا ہے۔اسے 'تعارف' کا عنوان بھی دیا جاتا ہے۔مقدمہ یا تعارف میں سب سے پہلے معلوم نسخوں کی تعداد بتائی جائے اور ان کے بارے میں مجمل اطلاع دی جائے۔ پھر ان نسخوں کا مفصل ذکر کیا جائے جن سے موجودہ متن تیار کرنے میں مدد لی گئی ہے۔اس کے بعد ان نسخوں کی تفصیل دی جائے جن کا

ایک دوسرے سے موازنہ کیا گیا ہے۔[1] ایک نسخہ کی دوسرے نسخہ پر برتری کے وجوہ اور بعض نسخوں کو خارج کرنے کے اسباب بتانا بھی ضروری ہے۔ ہر استعمال شدہ نسخہ کے اوراق کی تعداد، سطریں فی صفحہ (یا اشعار کی تعداد فی صفحہ)، کتب خانہ یا مالک نسخہ کا نام اور پتا، اگر نسخہ مختلف لوگوں کے قبضہ میں رہا ہے تو ان سب کے نام اور پتے، کاتب کا نام، کتابت کا معیار، رسم الخط، روشنائی اور کاغذ کی نوعیت، تاریخ کتابت، ابتدا اور خاتمہ کی عبارت کا بتانا ضروری ہے۔ کاتب کے ترقیمہ کی عبارت نقل کر دینے سے قاری کو نسخہ کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اگر نسخہ پر کسی رئیس یا مصنف یا شاعر کے سرپرست کا نام ہے تو وہ بھی بتایا جائے۔ اگر زیر بحث کتاب چھپ چکی ہے تو اس کی خوبیوں اور خامیوں کی نشان دہی اور موجودہ اڈیشن تیار کرنے کی وجہ یا وجوہ بتانا ضروری ہے۔

حوالہ میں مخطوطات کا پورا نام لکھنا ضروری نہیں بلکہ اس کے بدلے ان کے مخففات استعمال کرنا بہتر ہوگا۔ استعمال سے پہلے ان مخففات کا، کسی مناسب موقع پر بتا دینا ضروری ہے۔

نسخوں کا ذکر کرنے کے بعد محقق اپنے طریق کار کی وضاحت کرے اور اپنا اصول بتائے جس کی بنیاد پر اس نے متن تیار کیا ہے۔[2]

اس کے بعد مصنف کے حالاتِ زندگی، تصنیفات وغیرہ کا ذکر کیا جائے۔ لیکن اگر زیر تحقیق کتاب کسی معلوم و مشہور مصنف کی ہے تو پھر اس کی ضرورت نہیں۔ سب سے آخری چیز تصحیح کردہ متن پر، حسب موضوع، علمی، ادبی، فنی نقطۂ نگاہ سے تبصرہ ہوگا۔

حواشی و تعلیقات:

صحیح متن پیش کرنا ایک اہم اور مفید علمی خدمت ہے۔ لیکن اس کی اہمیت و افادیت حواشی و تعلیقات کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے موجودہ محققین اس کی طرف خصوصاً

---

[1] S. M. Katre-، کتاب مذکور، باب ۸، ص ۷۸

[2] S. M. Katre-، کتاب مذکور، باب ۸، ص ۸۳

توجہ کرتے ہیں۔مگر کتاب کو غیر ضروری حواشی وتعلیقات سے بوجھل نہ بنایا جائے۔

حواشی وتعلیقات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: (۱) الف: اختلافات نسخ اور وہ باتیں جن کا مقصد متن کی صحت اور تعین ہے، مثلاً تلفظ، تذکیر وتانیث وغیرہ کا اختلاف۔ (ب) مصنف کی لکھی ہوئی مختصر تعلیقات جو بہت کم ہوتی ہیں۔ (۲) [الف] جملوں اور عبارتوں کی تشریح، شخصیتوں کا تذکرہ، مقامات کا تعین، غیر معروف تلمیحات کا پس منظر وغیرہ، [ب] مصنف کی لکھی ہوئی طویل تعلیقات، [ج] غیر معروف اور متروک الفاظ کے معنی۔

پہلی قسم کے حواشی متن کے ساتھ، یعنی اسی صفحہ پر نیچے دئے جائیں تو بہتر ہے۔ فصل قائم کرنے کے لئے متن اور حواشی کے بیچ میں ایک لکیر کھینچ دی جائے۔ ان حواشی کو کتاب کے آخر میں بھی مسلسل نمبروں کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ اس طریقہ پر عمل کرنے سے طباعت میں سہولت ہوتی ہے، لیکن پہلے طریقہ سے مطالعہ میں آسانی ہوتی ہے۔ اسی لئے عموماً پہلے طریقہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ دوسری قسم کے حواشی، یعنی تعلیقات وتشریحات کو متن کے خاتمہ پر رکھنا بہتر ہے تاکہ قاری کی توجہ متن سے ہٹنے نہ پائے۔ بعض محققین ان کو بھی متن ہی کے صفحہ پر رکھتے ہیں۔ اس طریقہ کو خوشگوار نہیں کہا جاسکتا۔ تعلیقات یا تشریحات لکھتے وقت اختصار اور جامعیت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ متروک وغیر معروف الفاظ کے معنی فرہنگ کے عنوان کے تحت تعلیقات سے الگ دئے جائیں۔

کتابیات اور اشاریہ:

جس طرح تحقیقی مقالہ کے خاتمہ پر کتابیات یا فہرست مآخذ دی جاتی ہے اسی طرح مرتبہ کتاب کے آخر میں بھی ان کتابوں، رسالوں وغیرہ کی جو پیش نظر کتاب کے متن، مقدمہ اور تشریحات کے سلسلہ میں استعمال ہوئی ہیں فہرست دینا چاہئے۔ اس فہرست کے تیار کرنے کا طریقہ وہی ہوگا جو مقالہ کی کتابیات کے تیار کرنے میں اختیار کیا جاتا ہے۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ بھی دینا ہوگا۔ یہاں بھی وہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو مقالہ کے اشاریہ میں برتا جاتا ہے۔

عکس:

متن کے کم سے کم ایک صفحہ کا عکس کتاب میں ضرور شامل ہونا چاہئے۔ اگر مصنف کے ہاتھ کی تحریر مل سکتی ہو تو اسے ترجیح دی جائے گی۔

☆☆☆

کتابیات

(الف) انگریزی

1 Adler, Mortimer J., How to read a Book, New York, Simon and Schuster, 1940

2 Almack, John C., Research and Thesis Writing, Boston, Hughton Mifflin Co., 1930

3 Best, John w., Research in Education, Sixth Printing, Englewood Cliffs, N. J., Prentice-Hall, Inc., 1961.

4 Bowen, Catherine Drinker, Francis Bacon, London, Hamis Hamilton, 1963.

5 Cole, Arthur H,. and Bigelow, Karl W., A Manual of Thesis-Writing, eight Printing, New Yrok, John Wiley & Sons, Inc., 1956.

6 Darwin, Francis (ed), Life and Letters of Charles darwin, London, JohnMurray, 1887.

7 Dewey, John, How We Think, Boston, D.C.Heath 7 Co., 1933.

8 Dewey, John. The Quest for Certainty, London, George Allen and Urwin Ltd., 1930.

9 Ganter, Elliot S. M. and Cordasco, Francesco, Research and Report Writing, Eight Printing, new York, Barnes and Noble, Inc., 1960.

10 Good, Carter V. and Seates, Douglas E., Methods of Research. New York, Appleton-Century-Crafts, Inc., 1954.

11 Hall, F.W., A Companion to Classical Texts, Oxford, Clarendon Press, 1913.

12 Katre, S. M., Introduction to Indian textual Criticism, Bombay, Karnatak Publishing House, 1941.

13 Kelley, Truman Lee, Scientific Method, New York, The Maemillan Co., 1932.

14 Lucas, f. L., Style,London, Pan Boks Ltd, 1964.

15 Murry, J. Middleton, The Problem of Style, London, Oxford University Press, 1961.

16 Pearson, Karl, the Grammar of Science, London, J. M. Dent 7 Sons Ltd., 1943.

17 University of Oxford, members of the Faculty of English Language and Literature, Notes on the Presentation of Theses on Literary Subjects, Second Edition,Londo, Rupat Hart-Davis, 1958.

18 Whitney, Frederick Lamson, The Elements of Research, First Indian Edition, Bombay. Asia Publishing House, 1961.

19 Williams, Cecil B. and Stevenson, Allan H. A Research Manual First Edition, New York, Harper and Brothers, 1940.

20 A New English Dictionary on Historical Principles, Vol. VIII, Oxford,Clarendon Press, 1910.

21 Encyclopaedia Britannica, Vol. XXII, Chicago, William Benton, 1960.

22 Webstor's New International Dictionary of the English Language, Second Edition, Springfield, Mass., U.S.A., G., & C. Merriam Co., 1948.

(ب) اردو

۲۳ حالی، خواجہ الطاف حسین، حیاتِ جاوید، دہلی، انجمن ترقیٔ اردو، ہند، ۱۹۳۹ء

۲۴ حالی، خواجہ الطاف حسین، حیاتِ سعدی، لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۲۷ء

۲۵ ڈار، بشیر احمد، حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق، لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۵۸ء

۲۶ سلیمان ندوی، (مولانا) سید، حیات شبلی، اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۴۳ء

۲۷ شبلی، (مولانا)، شعرالعجم، طبع سوم، جلد چہارم، اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۲۳ء

۲۸ مالک رام و مختارالدین احمد، مرتبہ، نذر عرشی، نئی دہلی، مجلس نذر عرشی، ۱۹۶۵ء

۲۹ ارمغانِ علمی

(ج) رسالے

۳۰ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، جلد ۲۳، (۱۹۴۶-۴۷ء)

۳۱ فکر و نظر، علی گڑھ، جلد ۲، (۱۹۶۱ء)

۳۲ نقوش، لاہور، نمبر ۹۷، (۱۹۶۳ء)

۳۳ نوائے ادب، جلد ۲۱، شمارہ ۳

اشاریہ

(الف) اسماء و اشخاص

الف

آثارالصنادید ۲۵۔ ۳۰
آکسفورڈ ڈکشنری ۱۶
آکسفورڈ یونیورسٹی (پروفیسر) ۵۵
آلمک ۱۸
آیووا ۲۵
اڈیسن، تھامس ۱۸
اردو (رسالہ) (حاشیہ) ۳۲۔۴۱
افلاطون ۵۴
اناطول فرانس ۵۴۔۵۶
انشا ۸۰
اورینٹل کالج میگزین (حاشیہ) ۶۹

ب

بائرن ۱۸
بالزاک ۵۴
براؤن، اڈورڈ ۲۳
برہان (حاشیہ) ۳۳
بسٹ ۴۲۔۵۰
بسِول ۴۷
بیکن، فرانسس ۱۹

پ

پوسٹ گیٹ ۷۱
پیرسن ۲۰

ٹ

ٹالسٹائی ۵۴

ج

جیمز، ولیم ۵۴

ح

حالی، (مولانا) خواجہ الطاف حسین ۵۶

د

دیوان یقین ۸۱

ڈ

ڈارون، چارلز ۱۹
ڈیوی، میلول ۲۹۔۳۱

ر

ریسرچ اینڈ رپورٹ رائٹنگ، مصنفین ۲۱-۲۶-۴۲
ریسرچ مینول، مصنفین ۴۹
روسو ۵۴
رینکے ۲۳

س

سعید نفیسی ۲۳
سلیمان، سرشاہ ۲۳
سلیمان ندوی، (مولانا) سید
۲۳-۳۸-۵۴-۶۲-۴۸
سوداومیر، عہد ۸۱
سید احمد خان، سر ۲۴

ش

شکاگو یونیورسٹی ۱۷
شبلی (مولانا) ۲۳-۵۴-۵۵

ع

عبدالحق (مولوی) ۵۴-۵۵
عبدالقادر، شیخ ۲۴
عرشی، مولانا امتیاز علی خاں ۲۵

ف

فرحت اللہ بیگ، میرزا ۸۱

ک

کرافورڈ ۱۵-۱۷-۲۱
کون فیوشس ۵۷
کیلی (حاشیہ) ۱۷
کیوِنڈِش ۲۳

گ

گبن ۵۴
گلستاں ۵۷
گلیلیو ۲۳

ل

لِنڈ ۴۶
لوکس، پروفیسر ۵۵

م

محمود خاں شیرانی، حافظ ۲۴
مرے، مڈلٹن ۵۶
معارف (حاشیہ) ۶۹
میتھڈز آف ریسرچ، مصنفین ۱۸
میکالے ۵۴
مینول آف تھیسس رائٹنگ، مصنفین ۳۷

ن

نذیر احمد، ڈاکٹر ۷۸

نوائے ادب (حاشیہ) ۳۳

و

وِبسٹر (لغت) ۱۶
وھٹنی ۲۱_۳۸

ہ

ہچنز ۱۷
ہرشیل ۲۳
ہیلن ڈربی شائر ۲۵

(ب) موضوعات

الف

اسلوب ۷۲
اکتشاف (اکتشافات) ۲۰-۲۱
الفاظ (لفظوں) ۷۴
ایجاز ۶۲

ب

بنیادی ذرائع ۴۱

پ

پڑھنے کی رفتار ۵۸
پڑھنے کا فن ۵۷

ت

تحقیق ۱۵
اہمیت ۱۵-۱۹-۲۵
تعریف ۱۵-۱۶-۱۷-۲۰
خصوصیات ۳-۱۷-۲۲
مقصد ۱۹
تحقیق، تعلیمی ۱۹
تحقیقی مقالہ ۲۰-۷۳
تخیل ۲۴

ڈ

ڈیوی ڈیسمل سسٹم (طریقہ) ۲۹-۳۱-۳۲

س

سائنس ۲۲-۲۳
سائنسی طریقۂ کار ۲۲-۲۳
سائنسی نقطۂ نگاہ ۲۲
سوالنامہ، تعلیمی ۴۲

ف

فٹ نوٹ ۷۸

م

متن، تصحیح وترتیب ۷۱
محقق ۴۸
مفکرانہ خیالات ۲۴
منظم تخیل ۲۴
منظم دماغ ۱۵

و

واضح نثر ۷۲
وضاحت ۷۲

ضمیمہ

ڈاکٹر صلاح الدین المنجد کا متنی تنقید پر فاضلانہ عربی مقالہ ایک نایاب علمی دستاویز ہے۔ اس کا اردو ترجمہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عربی کے ممتاز عالم ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی نے ڈاکٹر صلاح الدین المنجد کے تعارف کے ساتھ (تحقیق، جام شورو: شمارہ: ۱۷، ۲۰۰۹ء میں) شائع کیا۔ یہ ترجمہ تعارف کے بغیر 'فکر و نظر' علی گڑھ میں بھی شائع ہوا تھا۔ اس مقالے کے کئی حوالے زیرِ نظر کتاب میں بھی آئے ہیں۔ اس مضمون کی افادیت 'مبادیاتِ تحقیق' کے حوالے سے بھی مسلّم ہے۔ لہٰذا اسے اساتذہ، طلباء اور عام محققین کے استفادے کے خیال سے زیرِ نظر کتاب میں شائع کیا جا رہا ہے۔

۔عبدالستار دلوی

عـربی : ڈاکٹر صلاح الدین المنجّد
ترجمہ : ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی

تحقیقِ متن کے اصول

(ڈاکٹر صلاح الدین المنجّد کا مصر کے ممتاز فضلاء میں شمار ہے۔ انہی کی کوششوں سے ابنِ عساکر (م ۵۷۱ھ) کی ''تاریخ مدینۃ دمشق''، شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) کی ''سیر اعلام النبلاء'' قاضی محمود عدوی (م ۱۰۳۲ھ) کی ''الزیارات بدمشق'' وغیرہ تحقیق و تصحیح ہو کر شائع ہوئی ہیں۔ مصر و شام کے علمی حلقوں میں ان کی کافی قدر و منزلت ہے۔ چناں چہ مجمع اللغۃ العربیہ، قاہرہ اور مجمع علمی عربی، دمشق کے بڑے باوقار ارکان کی صفِ اوّلین میں ان کو جگہ ملی ہے۔ ''مجلۃ معہد المخطوطات العربیہ'' قاہرہ کی ترتیب کی اہم ذمہ داری بھی آپ ہی کے سپرد ہے۔ یہ رسالہ علمی خطوط پر عربی مخطوطات کی نشر و اشاعت سے متعلق وقیع مضامین شائع کرتا رہتا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ رمضان ۱۳۷۵ھ میں شائع ہوا تھا۔ ذیل کا مضمون اسی مجلّہ کی جلد اوّل جزو دوم، ربیع الاوّل ۱۳۷۵ھ سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ مضمون کی فنی حیثیت کے پیش نظر ترجمہ میں الفاظ کی مطابقت کا پورا پورا لحاظ ہے۔ اس لئے وہ روانی جو آزاد ترجمہ کی ہوتی ہے شاید نہ ملے۔ ندوی)

گزشتہ ربع صدی میں عربوں نے قدیم علمی ورثہ کی نشر و اشاعت اور تحقیق و تدوین کی طرف اچھی خاصی توجہ دی ہے۔ مستشرقین کو اس سلسلہ میں اوّلیت حاصل ہے۔ اگرچہ ان کی عربی زبان سے واقفیت اور اس ضمن کی دوسری معلومات کم تھیں مگر وہ ایک صدی سے علمی اور

تحقیقی معیار کے ساتھ اس قدیم اثاثہ کی نشر واشاعت میں مشغول تھے۔

عربوں نے اس علمی تفتیش وتحقیق میں مستشرقین کی اقتدا کی ہے۔ بعض اس اقتدا میں نہایت کامیاب ثابت ہوئے اور جو ناکام رہے انہوں نے اپنی ناکامی کو بے التفاتی کے پردۂ خفا میں رکھنا چاہا اور بسا اوقات مستشرقین کے اس کارنامے کا مذاق اڑانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اسی پر بس نہیں ہوا بلکہ تحقیر کا یہ پہلو علمی اغماز اور عصبیت کی غلط روی کی صورت میں رونما ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ناشر خود ساختہ اصولوں کے مطابق نشر واشاعت کا کام انجام دینے لگا اور اس زعم میں گرفتار رہا کہ اس نے کچھ اچھے اصول وضع کیے ہیں۔

انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم مستشرقین کی ان خدمات کی اوّلیت تسلیم کریں جو وہ عربی علمی اثاثہ کی تحقیق وتفتیش کے سلسلہ میں پچھلی ایک صدی سے انجام دیتے رہے ہیں۔ انہی کا کمال علمی ذوق تھا جس نے نادر اور اہم مخطوطات کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا اور ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی، یہ نہ ہوتے تو شاید ہم ان متون (Texts) سے آشنا بھی نہ ہوتے جو آج ہماری دسترس میں ہیں۔

مستشرقین نے ان تمام اصولوں کو بہ طریقِ احسن عربی متن کی اشاعت کے سلسلہ میں برتا ہے جو عالمی ادبی (Classics) یونانی اور لاطینی کی اشاعت کے بارے میں یورپ کرتا رہا ہے۔ یہ اصول وقواعد دقتِ نظر اور امانتِ کار کے ضامن ہیں۔ ان میں کوشش یہ ہوئی ہے کہ اصل متن شائع شدہ صورت میں صحیح طور پر پیش کیا جائے۔ اس دور میں ان کا پورا پورا لحاظ مجلسِ مستشرقین، جرمنی نے اپنی اسلامی نشریات (Bibliotheca Islamica) میں کیا ہے جو مشہور مستشرق ھ۔ ریتر کی زیر نگرانی شائع ہوتی رہی ہیں۔ انہی کی اتباع فرانس کے ادارۂ غیوم بودہ (Association Guillaum Bude) نے بھی کی ہے۔ اس سے قبل تمام مستشرقین ان اصولوں کی پیروی کرتے رہے ہیں۔

عرب ناشرینِ متن کو مستشرقین کے علمی طریقہ کی اتباع لازم تھی ورنہ کم سے کم ممتاز اصولوں کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے تھا۔ لیکن بہت کم لوگوں نے ایسا کیا ہے۔

اس وقت دنیائے عرب میں ایک مہتم بالشان علمی بیداری پائی جاتی ہے اور ایک بڑی

تعداد قدیم متن کی اشاعت کی طرف مائل ہے۔ ناشرین نے بھی مختلف طریقے اختیار کر رکھے ہیں جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اب یہ ناگزیر ہے کہ اس کے کچھ آئین واصول وضع کئے جائیں جن کی پیروی محققین کے لئے اشاعتِ متن کے سلسلہ میں لازم قرار دے دی جائے تاکہ یکسانیت اور ہم آہنگی کا فقدان نہ ہو۔

ان اصولوں کے پیش کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ اشاعت کے طریقوں میں یک جہتی ہو اور لوگوں کو اس سے واقفیت ہو جائے۔ جرمن مستشرقین اور ادارۂ غیوم بودہ کے طریقۂ کار نیز دیگر پیش رو جنہوں نے روایات کے ضبط واہتمام کے سلسلہ میں قواعد وضع کیے ہیں اور ہم نے بھی جو کچھ اس سلسلہ میں اب تک لکھا ہے یہاں ان کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے۔ ان سب کے علاوہ ہمارے پیش نظر وہ نتائج بھی ہیں جو قدیم مخطوطات کی اشاعت کے سلسلہ میں حاصل ہوئے ہیں۔ ہم محققین کو ان کی پیروی اور تنقید وتبصرہ کی دعوت دیتے ہیں۔ اس طرح شاید وحدتِ کار کا کوئی مثالی طریقہ ہمیں حاصل ہو سکے۔

ماضی میں نشر واشاعت کے وضع قوانین کی چند کوششیں

اصل متن کو شائع کرنے کا کوئی خاص قاعدہ نہ ہونے کی وجہ سے بعض علمی ادارے، مجلسیں اور علماء مجبور ہوئے کہ مخطوطات کی اشاعت کے لئے اصول وضوابط مقرر کریں۔ ذیل میں ان کی اوّلیت اور افضلیت کا جائزہ پیش ہے۔

علمی اداروں میں مجمع علمی عربی، دمشق نے اس کی طرف سب سے پہلے توجہ کی ہے۔ ''تاریخ مدینۃ دمشق'' جیسی اہم اور اسی جلدوں پر مشتمل کتاب کی اشاعت کا خیال پیدا ہوتے ہی اس نے علماء وفضلاء کی ایک جماعت کو وضع اصول کی دعوت دی تاکہ اس عظیم تاریخ کی اشاعت میں ممدّ ومعاون ہوں۔ ان ارکان میں ہم بھی شامل تھے۔ اس مجلس نے جو مختصر اصول وضع کیے تھے۔ ان کے بنیادی خطوط یہ ہیں:

ان الغاية من تحقيق الكتاب جو تقديم نص صحيح لذلک يجب ان يعنى باختلاف الروايات وان ثبت ماصح منها

کتاب کی تحقیق کا مقصد یہ ہے کہ صحیح متن پیش کیا جائے۔ اس لئے ناگزیر ہے کہ اختلافِ روایات کی طرف پورا پورا دھیان ہو اور وہ عبارت داخلِ متن ہو جو صحیح تصور کی جائے۔

وان یوجز فی التعلیق کیلا یثقل النص بتعلیقات طوال
حواشی مختصر ہوں تا کہ متن طول طویل تعلیقات سے بوجھل نہ ہو۔

وأن تضبط الاعلام، و تفسر الالفاظ الغامضة، و یصرف النظر عن تخریج الاحادیث،
ناموں کا تلفظ واضح کیا جائے، مشکل الفاظ کی توضیح وتشریح ہو۔ احادیث کی تخریج سے صرفِ نظر کیا جائے۔

و ان یسمح بوضوع النقطة والنقطین ز الفاصلة واشارات الإستفهام والتعجب، لتوضیح النص
اس کی اجازت ہو کہ ایک نقطہ یا دو نقطے لگا کر، فاصلہ دے کر، سوالیہ اور تعجب کے نشان بڑھا کر اصل متن کی وضاحت کر دی جائے۔

و أن ثبت الآیات القرانیة بین قوسین مذهرین و أن ترقم سطور النص
قرآن کی آیتیں بیل دار قوسین کے درمیان ہوں۔ متن کی سطروں کا شمار بھی درج ہو۔

ایسے سرکاری ادارے جنہوں نے اس کام کے لئے اصول متعین کیے ان میں قابلِ ذکر وہ ادارہ ہے جہاں ابنِ سینا کی کتاب ''الشفا'' طبع وتحقیق ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ابراہیم مذکور نے طباعت سے متعلق لکھا ہے کہ ادارہ نے ''الشفا'' کے تمام نسخے حتی الوسع مہیا کیے۔ اس عبارت کو قابلِ ترجیح قرار دیا ہے جو ''مؤلف کے متن سے اقرب معلوم ہوئی اور صحیح طور پر معنی ادا کرتی تھی۔ اس نے اختلافِ قرأت وروایت کا ذکر وتعین بھی کیا اور اس کو مرجح قرار دیا۔ جو ادارہ کی نظر میں درستیٔ معنی وصحتِ عبارت کا ضامن اور ابنِ سینا کے الفاظ وتعبیرات کا حامل تھا۔ وہ

صورت قابلِ ترجیح قرار پائی جو مؤلف کی دیگر تصانیف کی تائید سے حاصل ہوئی۔'' ادارہ نے حاشیہ میں اختلافِ قرأت وروایت، ضروری لغوی تشریحات درج کی ہیں تا کہ ''حاشیہ متن اور اختلافِ روایات غیر ضروری اضافوں سے بوجھل نہ ہو۔ ادارہ نے ضرورت کے لحاظ سے طباعت کے رموز کا استعمال بھی کیا ہے کیوں کہ عصری معیارِ طباعت کی روح کا تقاضا یہی تھا۔''

مجمع دمشق اور ادارہ تحقیق ''الشفا'' ے اصولوں میں قرب ومماثلت ہے۔

طباعت واشاعت کے اصول وقواعد کے وضع کرنے میں ڈاکٹر محمد مندور اور استاد عبدالسلام ہارون نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ اول الذکر نے اپنے دو مضامین میں جو مجلّہ ''الثقافۃ'' میں شائع ہوئے تھے۔ مختصراً تمام اصول وقواعد سے بحث کی ہے، نیز ابنِ مماتی کی کتاب ''قواوین الدواوین'' پر بھرپور نقد وتبصرہ بھی ہے۔ دوسرے بزرگ نے ایک کتابچہ ''متن کی تحقیق واشاعت'' نام کا تصنیف کیا تھا۔ یہ ان تقاریر کا مجموعہ ہے جو موصوف نے دارالعلوم کے طلبہ کے سامنے پیش کی تھیں۔ دیگر علوم ومعارف کے ساتھ کچھ اصول وقوانین کی تفصیل بھی ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ عربی تہذیب وثقافت موجودہ نسل تک کس طرح پہنچی ہے۔'' کاغذ سازی کی صورت حال کیا تھی اور کتابت وحروف کس طرح ترقی پذیر ہوئے ہیں۔'' ان موضوعات پر گزشتہ چند سالوں میں نہایت گہرے اور پُراز معلومات مباحث ہمارے سامنے آئے ہیں مگر افسوس کہ مصنف نے ان سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ بعدازاں ''متن'' اس کی ''تحقیق'' اور ''تصحیف وتحریف'' نیز صحیح متن پیش کرنے اور اس سلسلہ کی دیگر عصری ضروریات کے اصول سے بحث کی ہے۔ ان کے علاوہ ضمناً ایسے امور بھی زیر بحث آئے ہیں جو ایک مبتدی ناشر کو پیش آتے ہیں۔ مصنف نے دوسری زبانوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی طرف رجوع نہیں کیا ہے ورنہ یہ کتاب جامع اور مکمل ہوتی۔ ''متن کی تحقیق'' اور ''تحقیقِ متن کے مُمدّ ومعاون علوم وفنون'' جیسے علوم الخطوط، علم المصادر وغیرہ میں خلط مبحث کر دیا ہے۔ یہ دونوں علوم ایک طویل مدت تک شاملِ درس ہوتے ہیں۔ اس لئے چند صفحات میں ان کا احاطہ کسی طرح ممکن نہیں۔

ہم یہاں ابتدائے تدوین، علم الخط، علم المصادر یا ناسخوں کی اصطلاحات یا عصری

مصطلاحات سے بحث نہیں کررہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کا علم فائدہ سے خالی نہیں لیکن یہ مسلّم ہے کہ ان کا علم ناشروں کو پہلے سے ہونا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ہم اپنی گفتگو کو ان علمی اصول وضوابط تک محدود رکھیں گے جو محقق کے لئے متن کی تحقیق وتخریج میں مددگار ثابت ہوں۔

نسخوں کی دستیابی اور ترتیب (الف) دستیابی:

۱۔ جب کسی قدیم مخطوطے کی تحقیق مطلوب ہو تو سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اپنی کوششوں کی حد تک ان تمام نسخوں کو دریافت کریں جو دنیا کے مختلف کتاب خانوں میں دستیاب ہوتے ہیں۔

۲۔ یہ مقصد کسی حد تک بروکلمن GAL کی اصل کتاب اور اس کے ذیل کی طرف رجوع کرنے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب اس ضمن کی تمام معلومات کو محیط نہیں ہوسکتی اس لئے محتاط روش تو یہ ہے کہ دیگر کتابخانوں کے مخطوطات کی فہرست کی طرف بھی رجوع کیا جائے جو بروکلمن کی دسترس سے باہر تھیں۔ یا اس کے شائع ہونے کے بعد منصۂ شہود پر آئی ہیں۔

۳۔ جب نسخوں کے وجود کا پتہ چل جائے تو فہرستوں کے ذریعہ ان کا ابتدائی علم ضرور حاصل کرایا جائے۔ وہ نسخے منتخب کئے جائیں جن کی سب سے زیادہ اہمیت ہو۔ ان کی عکسی تصویریں حاصل کی جائیں تاکہ متن کی صحیح شکل سامنے ہو اور تصحیف وتحریف کے مزید امکانات نہ پیدا ہوں۔

۴۔ اگر نسخے ایسے کتاب خانوں میں ہوں جن کی فہرستیں موجود نہ ہوں تو ان کی تصویریں حاصل کی جائیں پھر غائر مطالعہ ہو۔

ب۔ نسخوں کی ترتیب

نسخوں کے مراتب بہ صورتِ ذیل قائم ہوں گے۔

۱۔ سب سے بہتر قابلِ اشاعت نسخہ وہ ہوتا ہے جس کو مصنف نے خود لکھا ہو اور یہی اساسی

نسخہ ہوگا۔

۲۔ مصنف کے نسخہ میں حذف واضافہ کی صورت میں یہ معلوم کرنا ضروری ہوگا کہ کتاب کی تصنیف ایک وقت میں ہوئی ہے یا چند مراحل میں طے ہوئی ہے۔اس طرح ہمیں یقین ہوجائے گا کہ نسخۂ زیرِ بحث مصنف کی کوشش کی آخری شکل ہے۔

۳۔ مصنف کے نسخہ کے بعد وہ نسخہ زیادہ معتبر ہوگا جس کو مصنف نے خود پڑھا ہو یا اس کے سامنے پڑھا گیا ہو اور مصنف کے قلم نے اس کی تصدیق بھی کی ہو۔

۴۔ اس کے بعد وہ زیادہ وقیع ہوگا جو مصنف کے نسخے سے نقل کیا گیا ہو یا پھر ایسے ہی نسخے سے ''معارضہ'' یا مقابلہ کیا گیا ہو۔

۵۔ پھر وہ نسخہ معتبر ہوگا جو عہدِ مصنف میں نقل کیا گیا ہو اور اس پر علماء نے اس کا مطالعہ یا اس کی سماعت کی ہو۔

۶۔ پھر وہ نسخہ معتبر ہوگا جو مصنف کے عہد کے بعد نقل کیا گیا ہو اور اس پر علماء کی سماعت کی تصدیق نہ ہو۔

۷۔ ایسے نسخے جو مصنف کے زمانۂ حیات کے بعد نقل کیے گئے ہوں ان میں زمانہ کے لحاظ سے اوّلیت اور افضلیت ہوگی اور وہ نسخہ زیادہ اہم ہوگا جس کو کسی عالم نے نقل کیا ہو یا کسی عالم کے سامنے اس کی قرأت کی گئی ہو۔

اختلاف کی صورت میں ہم متأخر، صحیح اور منضبط نسخہ کا مقابلہ کر کے دیکھیں گے کہ اگر وہ قدیم تر نسخہ سے تصحیف وتحریف کے لحاظ سے بہتر ہے تو اسی کو اختیار کریں گے۔ یا ایسا نسخہ ہے جو بالکل متأخر ہے مگر خطاطی کا عمدہ نمونہ ہے اور مصنف کے نسخہ سے براہِ راست یا اس کے ہم عصر نسخہ سے منقول ہے یا اس کے علاوہ دیگر خصوصیات کا حامل ہے تو یہی مرجح ہوگا۔ اگر مصنف کا نسخہ دستیاب نہ ہو تو ہماری کوشش ہمیشہ یہ ہونی چاہئے کہ نسخہ تحریف وتصحیف سے پاک، صحیح اور مصنف کے نسخہ سے قریب تر ہو۔

۸۔ مختلف نسخوں کی دستیابی کی شکل میں یہ صحیح نہیں کہ صرف ایک نسخہ کی بنیاد پر کتاب شائع کردی جائے۔ یہ قید اس لئے ہے کہ کتاب شائع ہونے کے بعد علمی تحقیق وانضباط کی

محتاج نہ رہے۔

(ج) نسخوں کی حیثیات:

۱۔ بعض کتابیں متداول زیادہ ہوتی ہیں اس لئے ان کے نسخے بھی زیادہ ہو گئے ایسی صورت میں تین مختلف یا کم وبیش نسخے غلطیوں میں، حواشی میں، کمی یا زیادتی میں ایک دوسرے سے کافی حد تک مشابہ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک ہی اساسی نسخہ سے نقل کیے گئے ہوں۔

ایسی صورت میں یکسانیت رکھنے والے نسخے مختلف قسموں (Group) میں تقسیم کر دیے جائیں گے اور ہر ایک کے لئے کوئی حرف مقرر کر دیا جائے گا (جیسے قسم الف، قسم ب، قسم ج) اور ہر قسم میں سے ایک خاص نسخہ اختلافات کو واضح کرنے کے لئے منتخب کر لیا جائے گا۔

متن کی تحقیق۔ تحقیق کی غایت اور اس کا طریقۂ کار

تحقیق کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ مخطوطہ کو اس صحیح شکل میں پیش کیا جائے جو مصنف کی اصل کے مطابق ہو۔ شرح ایک علاحدہ شے ہے۔ اکثر ناشرین اس کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔ حواشی کو شرح و اضافہ سے بھر دیتے ہیں، شرح الفاظ، اشخاص کے تذکرے، مطبوعہ کتابوں کی عبارتیں اور مصنف کے مطلب کی وضاحت یہ تمام باتیں نا قابلِ قبول حد تک شامل کر دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں نفسِ متن سے مطالعہ کرنے والوں کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔

تحقیق کا کام ذیل کی باتوں کا مقتضی ہے:

۱۔ صحتِ کتاب، نام اور مؤلف کی طرف نسبت کی تحقیق۔

۲۔ اگر نسخہ اساسی ہے اور مصنف کے قلم کا لکھا ہوا ہے تو ویسا ہی نشر ہوگا۔

۳۔ اگر مصنف نے کوئی عبارت کسی حوالے سے اخذ کی ہے تو یہ عبارت اصل سے مقابلہ کی جائے گی اور حاشیے میں مختصراً کمی یا زیادتی کا ذکر ہوگا۔ گویا اس طرح لکھا جائے گا: یہ عبارت فلاں کتاب میں بایں الفاظ مختلف ہے، یا اضافہ ہے وغیرہ۔

۴۔ کبھی مصنف ماخذ کا حوالہ نہیں دیتا ہے۔ اگر محقق ان عبارتوں کا پتہ چلا لے اور اصل متن سے مقابلہ کر لے تو اچھا ہے تا کہ صحتِ متن کا یقین ہو جائے۔ یہ دو شقیں (۳ و ۴) صرف صحتِ متن کے کلی اطمینان کے لئے ہیں۔

۵۔ کبھی قلم کی لغزش یا حافظہ کی خطا، کسی لفظ یا نام کے اندراج میں مصنف سے غلطی کا ارتکاب کرا دیتی ہے۔ محقق کا فرض ہے کہ ایسی کوتاہیوں کا ذکر حاشیہ میں کر دے اور متن کو اصل کے مطابق رہنے دے کیوں کہ مصنف کا اپنے قلم سے کسی ایسے متن کا لکھنا اس کی تربیت، معلومات اور علمی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے۔

۶۔ اگر نسخے مختلف ہوں تو ایک نسخہ اساس بنے گا اور اس کے متن کی تصدیق کی جائے گی۔

۷۔ حاشیہ میں نسخوں کے اختلاف یعنی روایات کا اختلاف مذکور ہوگا۔

۸۔ روایتوں کے اختلاف کی صورت میں محقق صحیح اور مرجح شکل متن میں شامل کرے گا۔ حاشیہ میں محرّف، مصحف اور غلط لفظ جیسا ہے ویسا ہی اندراج ہوگا۔

۹۔ اگر کسی نسخہ میں کوئی ایسا اضافہ ہے جو معتمد علیہ نسخہ سے ساقط ہے تو یہ اضافہ اصل متن میں شامل ہوگا اور حاشیہ میں اس کا ذکر کر دیا جائے گا۔ یہ صرف اسی صورت میں ہوگا جب مصنف کا اضافہ ثابت ہو نہ کہ ناسخ کا۔ ناسخ کا اضافہ حاشیہ میں درج ہوگا۔

۱۰۔ محقق کو اصل متن سے ساقط شدہ حرف یا لفظ کو قوسین میں بڑھانے کی اجازت ہے۔ (دیکھیے رموز) قدماء نے سندِ حدیث یا متنِ حدیث میں کوئی چیز ساقط ہو جائے تو بڑھانے کی اجازت دی ہے یا حروف ماند پڑ گئے ہوں تو انھیں اجاگر کیا جا سکتا ہے۔

۱۱۔ اگر کسی مخطوطہ میں کوئی مقام کرم خوردہ ہے یا سوراخ ہے جس کی وجہ سے اصل متن متاثر ہوا ہے اور یہ عبارت کسی دوسری کتاب میں چاہے مطبوعہ ہو یا مخطوطہ ملتی ہے تو متن وہاں سے مکمل کر لیا جائے گا اور حاشیہ میں اشارہ کر دیا جائے گا۔ یہ اضافہ قوسین کے درمیان ہوگا (دیکھیے رموز) اگر محقق کو کرم خوردہ یا خالی جگہ کا کسی اور ذریعہ سے پتہ نہ چل سکے تو ان کی مقدار کا حاشیہ میں ذکر ہوگا۔

۱۲۔ بعض ناشرینِ کتب مختلف نسخوں کی موجودگی میں عمدہ نسخہ کو اختیار نہیں کرتے بلکہ بیک

وقت متعدد نسخوں پر اعتماد کرتے ہیں۔ ناشر کو اس کی اجازت ہے مگر غلطیوں کا ایسی صورت میں امکان ہے الّا یہ کہ مصنف کی شخصیت، اس کی زبان اور اسلوبِ بیان سے واقفیت ہو۔ بہتر تو یہی ہے کہ ایک نسخہ کو بنیاد بنایا جائے اور مقابلہ کر کے صحیح روایت درج متن ہو۔

۱۳۔ قدماء کا یہ طریقہ کار رہا ہے کہ جب انھیں دو نسخے دستیاب ہوتے تو ایک دوسرے سے مقابلہ و معارضہ کرتے اور ہر ایک کے اختلاف کو کنارے (ہامش) پر لکھ دیتے کہ فی نسخہ: کذا۔ ایسی صورت میں جو تحریر کتاب کے کنارے پر ہوگی وہ دوسرے نسخہ کے اختلاف کو اور متن کی افضلیت کو بھی نمایاں کرے گی۔ ان باتوں کا حاشیہ میں ضرور ذکر ہونا چاہئے۔

۱۴۔ کبھی کوئی کتاب کسی عالم کے زیرِ مطالعہ رہتی ہے۔ وہ بعض الفاظ کی درستگی بھی کر دیتا ہے۔ ایسے اصلاح شدہ الفاظ نسخہ کی قدر و قیمت میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ اگر محقق ان اصلاحات کا ہم خیال ہو تو انھیں متن میں داخل کر دے اور اصل کی طرف حاشیہ میں اشارہ کرے۔ عام حالات میں یہ ضروری ہے کہ حاشیہ میں ان تمام تعلیقات کا ذکر ہو جو کسی نسخہ کے کنارے پر پائے جاتے ہیں۔

رسم الخط

اصل تو یہی ہے کہ متن کا رسم الخط مؤلف کے قلم کے نسخہ کے مطابق ہونا چاہئے لیکن عربی رسم الخط مختلف ادوار سے گزرا ہے اس لئے موجودہ املا کا لحاظ بہتر ہوگا۔ اس کی اجازت قدماء سے بھی ثابت ہے۔ ہمیں ایسے قدیم متن سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو غیر منقوط ہیں۔ اسلئے بغیر نقطہ انھیں شائع نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی ایسے متن بھی سامنے آتے ہیں جن میں ہمزہ، ضمہ، فتحہ، کسرہ، تشدید اور جزم کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ اس لئے انھیں ایسی صورت میں شائع کرنا بعض التباس کا باعث ہوتا ہے۔ اس کے لئے مناسب ہے کہ ذیل کی صورتیں اختیار کی جائیں۔

۱۔ معنی کی تبدیلی کی صورت میں ہمزہ ابتدائی کی حرکت ضرور واضح کی جائے جیسے: اعلام، أعلام۔

۲۔ الف مقصورہ اور یاء کے درمیان قرأت کے التباس کو رفع کرنے کے لئے یاء کے نیچے دو نقطے ضرور ہونے چاہئے جیسے أبی، أبی (اخیر شکل میں یاء کے نیچے دو نقطے ہوں گے۔م)

۳۔ تشدید ہمیشہ لکھی جائے۔

۴۔ ان اسماء کے الف جو عام طور پر کتابت میں حذف کردیے جاتے ہیں ضرور لکھے جائیں جیسے: سلیمان بجائے سلیمن، حارث بجائے حرث، خالد بجائے خلد، معاویۃ بجائے معویۃ، مروان بجائے مرون، اور مالک بجائے ملک۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مجمع علمی عربی نے ''تاریخ دمشق'' کی اشاعت کے وقت صرف قرآنی اسماء کا قدیم املا بحال رکھا تھا۔ جیسے: اسحٰق، ابراہیم، اسمٰعیل۔

وہ الفاظ جن میں الف محذوف خیال کیا جاتا ہے۔ میری رائے میں بہتر یہ ہے کہ الف لکھا جائے۔ جیسے لاکن بجائے لکن، ہاؤلاء بجائے ہؤلا، ہاذا بجائے ہذا..... الخ۔ مغرب اقصی میں ان الفاظ کی کتابت میں الف کا اظہار ضرور کرتے ہیں۔

۵۔ اعداد کو الگ الگ لکھنا چاہئے۔ سبع مائۃ بجائے سبعمئۃ یا سبعمایۃ، ثلاث مئۃ بجائے ثلثمئۃ یا ثلاثمایۃ

محقق کو مخطوطات سے بحث کرتے وقت مقدمہ میں ان کے رسم الخط کی بات لکھ دینا چاہئے۔ نیز ان کے نمونے بھی پیش کردیئے جائیں اور ان کی تبدیلی میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہو اس کا بھی ذکر ہو۔

علامتِ اختصار

نفسِ متن میں کچھ الفاظ یا جملے بار بار دہرائے جاتے ہیں، جیسے آنحضور کے لئے ''صلوٰۃ وسلام'' یا متوفی کے لئے ''رحمۃ اللہ'' کہنا یا صحابہ کے لئے ''رضی اللہ'' کے الفاظ یا روایت حدیث میں ''حدثنا، أخبرنا، أنبأنا'' کے الفاظ۔ قدماء نے بعض الفاظ اور اسمائے کتب کا اختصار

بھی استعمال کیا ہے، ایسے حرف دو حرف کے رموز ذیل میں درج ہیں:

رحمۃ اللہ	رحہ	تعالیٰ	تع
رضی اللہ عنہ	رضہ	الی آخرہ	الخ
انتھی	اھ	حدثنا	ثنا
اخبرنا	انا	انبانا	انبا

''انبانا، حدنا، اخبرنا کا اختصار یہی نہیں کہ صرف اسانید کے بیان میں ہم پڑھتے ہیں بلکہ کبھی کبھی یہ نفسِ متن میں بھی ملتے ہیں۔ حدیث کی کتابوں میں ''صحاح ستہ'' وغیرہ کے مختصرات بھی مستعمل ہیں جیسے بخاری کی (خ)، مسلم کی (م)، ترمذی کی (ت)، ابوداؤد کی (د)، نسائی کی (ن) اور قزوینی کی (ق) علامتیں مطالعہ میں آئی ہیں۔

بعض مستشرقین نے بار بار آنے والے الفاظ کے اختصار میں اسی طریقہ کی اتباع کی ہے۔ اس کی پیروی حاشیہ میں مصادر کے ناموں کے اختصار میں بھی کی جاسکتی ہے۔ (دیکھیے مصادر)

شکل ۱۳

متن کے مشکول کرنے کے سلسلہ میں ذیل کے اصول کی پیروی کی جاسکتی ہے۔

۱۔ جب اصل متن کا کوئی جز یا کل مشکول ہو تو ہر جگہ اس کا اہتمام ہونا چاہئے۔

۲۔ آیاتِ قرآنی اور احادیث بہر صورت مشکول ہوں گے۔

۳۔ مشکل اشعار اور امثال مشکول ہوں گے۔

۴۔ اور ایسے الفاظ جن کو مشکول نہ کیا جائے تو معنی مشتبہ ہو جائیں جیسے ماضی مجہول میں ضرب وضرب کا فرق۔

۵۔ ایسے اسماء جو عجمی، مرکب یا مشکل ہیں رجال اور تذکرے کی کتابوں کی طرف رجوع کر کے مشکول کیے جائیں گے۔

مقدمہ میں یہ لکھنا ضروری ہے کہ نفسِ متن مشکول تھا یا بعد کا اضافہ ہے۔

عنوانات

بابوں اور فصلوں کے عنوانات جلی حروف میں نفسِ متن میں لکھے جائیں گے۔

متون کی تقسیم وترقیم:

۱۔ مؤلف کی تقسیم وترتیب کی پیروی ہوگی۔

۲۔ ایسا متن جس کی اصلاً تقسیم نہیں ہے تو اس کی بہ شرطِ ضرورت ازسرِ نو تقسیم وتبویب وضاحت کے لئے ہوگی۔ ہر فصل کا الگ عنوان قوسین [ ] کے درمیان ہوگا۔

۳۔ اگر نفسِ متن ابواب میں منقسم ہے تو ابواب کے نمبر ڈالے جائیں گے۔

۴۔ اگر زیرِ بحث کتاب تراجمِ رجال پر مشتمل ہے تو صاحبِ ترجمہ کا نام کتاب کے کنارے متن کے حروف کے سائز میں لکھا جائے گا یا پھر صفحہ کے بیچوں بیچ میں ہوگا۔ تراجم کے اعداد وشمار بھی ہوں گے۔

۵۔ حدیث کی کتابوں میں احادیث کے نمبر درج کیے جائیں گے۔

۶۔ دواوینِ شعر کے ابواب بحالہ قائم رہیں گے یا حروفِ تہجی کے مطابق مرتب کیے جائیں گے۔ قصائد وقطعات کے نمبر ڈالے جائیں گے۔

۷۔ چاہے نظم ہو یا نثر متن کی سطروں کے اعداد وشمار پانچ پانچ یا تین تین کے وقفہ سے دیے جائیں گے۔

احادیث سے متعلق:

۱۔ ''اخبرنا، حدثنا، انبانا'' کے الفاظ جو سندِ احادیث میں وارد ہوں گے اختصاراً لکھے جائیں گے۔

۲۔ اسانیدِ حدیث خفی حروف میں متن کے ہم شکل ہوں گے۔

۳۔ متنِ حدیث سے پہلی سطر کی ابتدا ہوگی اور حدیث کا پہلا راوی متنِ حدیث میں شامل ہوگا۔

نقطے، فاصلے اور اشارات:

۱۔ معنی کی تکمیل کے بعد جملوں کے آخر میں (ٹھہراؤ) کا نقطہ ہوگا۔

۲۔ فاصلہ رکھا جائے گا۔ مگر فاصلہ کے ساتھ نقطہ کا استعمال نہ ہوگا۔

۳۔ استفہام اور تعجب کے نشانات اپنی اپنی جگہ ہوں گے۔

۴۔ دو نقطے قول کے بعد مستعمل ہوں گے، جیسے: قال محمد:

جب دو قول ہوں تو دوسرے قول کے بعد استعمال ہوگا۔ اس کی مثال یہ ہوگی قال محمد، قال خالد:

۵۔ مُسجّع متن کی صورت میں سجعات میں فصل ہوگا۔

۶۔ اگر اصل متن کرم خوردہ ہو تو اس کی جگہ ہر لفظ کے لئے تین نقطے رکھے جائیں گے۔

قوس، خطوط اور رموز کا استعمال:

( ) بیل دار قوسین آیات قرآنی کے لئے مخصوص ہیں۔

" " جفت فاضلات ان کتابوں کے نام پر مشتمل ہوتے ہیں جو متن میں شامل ہوتے ہیں۔

-- -- یہ دو چھوٹی لکیریں ظاہر کرتی ہیں کہ مابین کا جملہ معترضہ جملہ ہے۔

| | یہ دو عمودی خط یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اضافہ اساسی نسخہ کے علاوہ کسی اور نسخہ کا ہے۔

< > مکسور قوسین یہ بتاتے ہیں کہ حروف یا لفظ کا اضافہ سابق کلام کے مطابق ناشر کی طرف سے کیا گیا ہے۔

[ ] مربع قوسین اس کی شہادت دیتے ہیں کہ مابین کسی دوسرے متن سے ماخوذ ہے یا استشہاداً ہے یا پھر ان سے جدید عنوان کا اظہار ہوتا ہے۔

( ) یہ قوسین نفسِ متن میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مخطوطہ کے ورق کا پہلا رخ ہے۔ وہ اس طرح لکھا جائے گا۔ (۱ ۲۵)۔

( ) یہ قوسینِ نفسِ متن میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مخطوطہ کے ورق کا دوسرا رخ ہے۔ وہ اس

طرح لکھا جائے گا (۲۵ ب)۔

(کذا) کذا قوسین میں اس وقت لکھا جاتا ہے جبکہ قرأت محقق کو مبہم معلوم ہو اور بعینہٖ رکھ دے۔

حرف کے رموز ہر مخطوطہ نسخہ کے لئے الگ الگ مقرر کیے جاتے ہیں۔ بسا اوقات یہ حرف صاحب نسخہ کے نام سے ماخوذ ہوتا ہے یا کبھی اس کتاب خانہ کا جز ہوتا ہے جہاں سے یہ نسخہ دستیاب ہوتا ہے یا اس شہر کے نام کا جہاں یہ کتاب خانہ قائم ہے۔

اقسامِ مخطوطہ کے لئے ابجد کے حروف مستعمل ہوتے ہیں، جیسے قسم ب، قسم ج۔

حواشی

ابھی تک شائع ہونے والے متن کے خارجی مظہر کی تفصیل تھی۔ مگر اصل میں علمی اور تنقیدی کام کا معیار حواشی سے معلوم ہوتا ہے۔ مستشرقین اس کو ایک اہم فن گردانتے ہیں اور حقیقتاً یہ علمی مہارت کا طالب بھی ہے۔

ہمارے محققوں نے حواشی لکھنے میں مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔ ایک جماعت تو حاشیہ میں اختلافِ نسخ دیتی ہے اور تعلیقات آخر کتاب سے ملحق کرتی ہے۔ اکثر فرانسیسی مستشرقین کا طرزِ عمل یہی رہا ہے۔ ایک دوسرا فریق حاشیہ میں اختلافِ نسخ دیتا ہے پھر تعلیقات ایک لکیر کی فصل سے وہیں درج کر دیتا ہے۔ بعض جرمن مستشرقین نے یہی طرز اختیار کیا ہے۔ تیسرا فریق کوئی فصل قائم نہیں کرتا۔ چوتھا فریق وہ ہے جو صرف متن دیتا ہے اور اختلافِ روایات اور تعلیقات کو کتاب کے آخر میں درج کرتا ہے۔

ہم نے ایسے محقق بھی پائے ہیں جو شرح، تعلیق اور تفسیر میں غلو برتتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ملتے ہیں جو بالکل پہلو تہی کر جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سا مناسب طریقہ ہے جو لازم اتباع ہو سکتا ہے۔

جب نفسِ متن کی تحقیق کا مقصد صحیح متن مؤلف کے منشا کے مطابق پیش کرنا ہو تو پہلی

شکل اختیار کی جائے گی اور یہ صحیح بھی ہے۔ نسخوں کا اختلاف صاف بتادے گا کہ اصل متن میں کیا ہونا چاہئے۔ بایں صورت اولاً حواشی اختلاف نسخہ کے لئے خاص کردیے جائیں گے پھر متن کے مصادر کا ذکر ہوگا یا اس کا ذکر ہوگا جس سے محقق نے رہنمائی حاصل کی ہے۔ یہ متن کی صحت کی مزید وضاحت کرے گا۔

مصادرِ متن کے باب میں درج ذیل باتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ مصادر نقل: مثلاً قال ابن سعد... حاشیہ میں یوں لکھا جائے گا: طبقات ج کذا ص کذا۔

۲۔ آیاتِ قرآنی: آیت اور سورہ کا نمبر درج ہوگا۔

۳۔ احادیث: احادیث کی تخریج ہوگی۔ مثلاً اخرج احمد فی مسندہ۔ مسند کے کس جز میں ہے اور اگر حدیث نمبر دار مذکور ہے تو حدیث کا کیا نمبر ہے۔ درج کیا جائے گا۔

۴۔ اشعار اور شواہد: اگر ممکن ہو تو دواوین کے حوالے ہوں گے، ادبی کتابوں کی مدد سے روایات کے اختلافات کی نشان دہی ہوگی۔ اگر مجہول شعر ہو تو حتی الوسع محقق قائل کا پتہ چلائے گا۔

اب صرف نفسِ متن میں مذکور شخصیتوں اور جگہوں کے نام اور الفاظ رہ گئے۔ اگر نام مقام اور لفظ کی صحت مقصود ہو تو حاشیہ میں درج کیا جائے گا۔ اگر افراد کے تذکرے، مقام کا تعین اور الفاظ کی توضیح وتشریح مقصود ہے تو بہتر یہی ہے کہ آخر کتاب میں ضمیمہ کے طور پر لکھ دیا جائے۔ یہ اس لئے ہوگا کہ متن حاشیہ کی کثرت اور شرح کی طوالت سے بوجھل نہ ہو۔ اگر ضمیمہ لگانا کسی سبب ممکن نہ ہو تو صرف شخصیات کا سالِ وفات، مصادر کا ذکر بغیر کسی تشریح کے درج کیا جاسکتا ہے۔ مقامات کے سلسلے میں ذکرِ مقام ومصادر بغیر کسی تشریح کے درج کیا جاسکتا ہے۔ اب رہے الفاظ، خصوصاً وہ الفاظ جو متداول کتب لغت میں نہیں ملتے یا ایک خاص تمدن و ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں تو بہتر صورت یہی ہے کہ آخر کتاب میں ضمیمہ کے طور پر ان کی توضیح وتشریح کردی جائے۔

۵۔ وہ تعلیقات جو متن کے کنارے (ہامش) پر ہوں ان کو حاشیہ میں لکھا جائے گا اور موقع

بہ موقع ان کا ذکر کر دیا جائے گا۔

اجازت اور سماع:

۱۔ گزشتہ زمانہ میں درس و تدریس اور عصری امتیاز کے سلسلے میں اجازت (منادلہ، سماع، قرأت) کی بڑی اہمیت تھی۔ اس قسم کی شہادتیں اگر مخطوطات میں ملیں تو ان کو متن کے ساتھ ضرور شائع کرنا چاہئے۔

۲۔ اصل اجازت یا سماع کی ہر سطر الگ لکھی جائے گی۔

۳۔ سطروں کے اعداد لکھے جائیں گے۔ اعداد متعارف قوسین ( ) کے درمیان ہوں گے۔

۴۔ سماعات کا خفی حروف میں بایں طور ذکر ہوگا: سامع، قاری اور سماع کی تصدیق کرنے والے کے نام، سننے والوں کی تعداد، مقامِ سماع اور تاریخِ سماع۔

فہرستیں

فہرست تیار کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ شائع شدہ کتاب کی افادیت اور اس سے استفادہ ہر محقق کے لئے آسان ہو جائے۔ مستشرقین کی شائع کردہ کتابیں اپنی جامع فہرستوں کی وجہ سے کافی سودمند ثابت ہوئی ہیں۔

فہرستیں کتاب کے موضوع کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ایک کتاب کی فہرست دوسری کتاب کی فہرست کے طرز کی نہ ہو۔ یہ فہرستیں کوئی نئی چیز نہیں پیش کرتی ہیں۔ بلکہ نفسِ کتاب ہی کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ بعض محققین نے فہرست سازی میں غلو سے کام لیا ہے، جو بالکل بے سود ہے۔ چنانچہ بعضوں نے معجم لغت کے الفاظ کی فہرست تیار کی ہے۔ یہ عجیب بات ہے۔ معجم تو بہ ذاتِ خود الفاظ کی مرتب فہرست کا نام ہے۔ نمونہ کی فہرستیں یوں تیار کی جاسکتی ہیں:

۱۔ ناموں کی فہرست۔ مردوں، عورتوں، قبیلوں، گروہوں..... کی فہرستیں

۲۔ مقامات اور شہروں کی فہرست۔

۳۔ متن میں مذکورہ کتابوں کی فہرست ۔ اس سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ مؤلف کے ماخذ ومصادر کا اکثر پتہ چل جاتا ہے۔

کتاب کا موضوع جن باتوں کا مقتضی ہوتا ہے اس کے لحاظ سے فہرستیں تیار کی جاتی ہیں۔ دیوان شعر یا کسی ادبی کتاب کے اشعار کے قوافی کی فہرست ہوتی ہے۔ اگر ممکن ہو تو صدر ابیات کی فہرست بھی مرتب کی جائے۔ حدیث کی کتاب میں بہ ترتیب حروفِ تہجی حدیث کے ابتدائی حروف کی فہرست بھی مرتب ہوتی ہے۔ آثارِ قدیمہ کی کتابوں میں قدیم مقامات اور نقشہ سازی (Topography) کی فہرست بھی ہوتی ہے۔ تذکرہ کی کتابوں میں ماسوا ضمنی افراد، زیرِ بحث افراد کی فہرست ترتیب دی جاتی ہے۔ تاریخ کی کتاب میں میں اہم واقعات و حوادث کی فہرست مرتب ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

کسی تہذیب وتمدن کی عکاسی کرنے والے الفاظ کی فہرست ضروری ہونی چاہئے۔ ایسے الفاظ جو معجم لغت میں عام طور پر نہیں ملتے ان کی فہرست ضرور ہو ایسی تمام فہرستوں کو پیش نظر رکھ کر ایک الگ معجم لغت تیار کیا جا سکتا ہے جو ہمارے قدیم متداول معجم لغت کے ذخیروں میں نہیں ملتے۔ یہ معجم لغات زمانہ کی تبدیلیوں کا ساتھ نہیں دے سکے ہیں اس لئے ان کی وسعتوں کو بھی نہیں سمو سکے۔

فہرستیں دو قسم کی ہوں گی:

۱۔ ایک تو بسیط فہرست۔ مثلاً علم کا ذکر ہو تو صفحات اور کتاب کا حوالہ بھی دے دیا جائے۔

۲۔ دوسری مفصل فہرست۔ وہ یوں ہوگی کہ جس علم کا نام مذکور ہو وہ خفی حروف میں ہر صفحہ پر مناسب طریقہ سے درج ہو۔ اسی ذیل میں وہ فہرستیں بھی آتی ہیں جنھیں بعض محققین نے موضوع کے لحاظ سے مرتب کیا ہے۔ یہ کام کافی محنت چاہتا ہے۔ لیکن نہایت فائدہ بخش ہے۔

فہرستیں اس مفروضہ پر تیار کی جاتی ہیں کہ محقق اس کے ذریعہ مجمل علم حاصل کر سکے گا۔

مقدّمہ

جب کوئی محقق متن کی طباعت کا کام ختم کر لیتا ہے تو کتاب کا مقدمہ لکھنے بیٹھتا ہے اس لئے کہ بسا اوقات مقدمہ میں کتاب کے صفحات کا ذکر ناگزیر ہوتا ہے اور یہ اس وقت تک انجام نہیں پا سکتا جب تک کہ کتاب طبع نہ ہو گئی ہو۔

مقدمہ میں ذیل کی تین باتیں ہونی چاہئیں:

۱۔ کتاب کا موضوع اور اس موضوع پر جو کتابیں لکھی جا چکی ہیں ان کا ذکر۔

۲۔ نفسِ کتاب اور اس موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں میں اس کا مقام، اس سے دریافت شدہ نئی باتیں، مؤلف کی قدر و قیمت، مقام علم و فضل اور حالاتِ زندگی، اس کے ساتھ ساتھ ان مصادر کا ذکر جہاں اس کے حالات دستیاب ہوتے ہیں۔

۳۔ اس مخطوطے کا تفصیلی بیان جس پر اعتماد کر کے یہ کتاب نشر کی گئی ہے مخطوطہ کی توضیح و تشریح کے وقت ذیل کی باتوں کا خیال رکھا جائے گا۔

۱۔ صفحہ اوّل پر کتاب اور مؤلف کا کیا نام مذکور ہے۔ کتاب کا نام اور اس کی نسبت چھان بین۔

۲۔ ناسخ اور تاریخِ نسخ، اگر یہ مشہور شخص ہے تو جن لوگوں نے اس کے حالات لکھے ہیں۔ ان کا حوالہ۔

۳۔ اگر کتاب پر مؤلف کا نام مذکور نہ ہو تو محقق اس کے موضوع اور اسلوبِ بیان نیز ان اسماء کے ذریعہ جن کو دیکھنے یا ملنے کا ذکر اثناء کتاب میں ملتا ہے، پتہ چلانے کی کوشش کرے گا۔ اگر کتابت کی تاریخ نہ ہو تو مخطوطہ کی قدامت کا اندازہ، حروف اور کاغذ کے ذریعہ کیا جائے گا۔

۴۔ مخطوطہ کے اوراق کی تعداد نیز اس کی تقطیع کا پیمانہ درج ہوگا۔ یہ بھی بتایا جائے گا کہ ہر ورق میں کتنی سطریں ہیں اور سطر کی لمبائی کیا ہے۔ حاشیہ کتنا ہے اور اس کی مقدار کیا ہے۔

۵۔ حروف کی کیفیت ونوعیت۔ پورا نسخہ ایک خط میں ہے یا مختلف ہاتھوں کا لکھا ہوا ہے

۶۔ کس رسم الخط کی کاتب نے اتباع کی ہے۔ اگر محقق متنِ کتاب کا املا بدل دے تو نمونے ضرور درج کرے۔

۷۔ روشنائی کی نوعیت اور مختلف رنگوں کا ذکر۔ کبھی متن کتاب سیاہ روشنائی سے لکھی جاتی ہے اور عنوانات سرخی سے۔ مسجّع عبارتوں میں تو اصل کو بھی سرخ یا نیلگوں روشنائی سے لکھتے ہیں۔ ان صورتوں میں تمام باتیں درج ہونی چاہئیں۔

۸۔ کاغذ اور اس کی نوعیت۔

۹۔ تعلیقات

۱۰۔ گوٹ (ہامش) پر تعلیقات کا ذکر۔

۱۱۔ اجازات (مناولہ، درس کی اجازت، سماع کی اجازت) کا مقدمہ میں ذکر ہوگا اور اصل عبارت کتاب کے آخر میں درج کردی جائے۔

۱۲۔ جن جن لوگوں کی ملکیت میں رہی ہے ان کا ذکر (تملیکات)۔

۱۳۔ اوّل صفحہ اور اخیر صفحہ یا کسی اور صفحہ کا عکس ہونا چاہئے۔ اس کے تحت متن کے زیرِ بحث موضوع کا ذکر کردیا جائے گا۔ اگر مصنف کے خط کا سراغ لگتا ہو تو بہتر ہے اس کا بھی عکس شاملِ کتاب ہو۔

۱۴۔ اگر متن زیرِ بحث کی اساس متعدد نسخوں پر ہے تو ان تمام نسخوں کی تفصیل ہوگی۔

۱۵۔ نسخوں کے ذکر کے بعد رموز کا ذکر ہوگا۔ نسخوں اور قوسوں کے رموز۔

مصادر

محقق کو تحقیق وحواشی اور مقدمہ کے لئے مختلف کتابوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اس لئے آخر میں مصادر کا ذکر ضرور ہونا چاہئے، جہاں مؤلف کا نام، کتاب اور تاریخِ اشاعت، ناشر اور مطبع کا ذکر بھی ہوگا۔ شائع شدہ کتابوں میں ناشرین کا بایں طور ذکر کیا جائے گا۔ معجم البلدان: یاقوت حموی، تحقیق: دستنفلد، لیپسک ۱۸۷۰م

اگر اسماء مصادر کے مختصرات حواشی میں مستعمل ہوتے ہیں تو مصادر کی ابتدا میں مکمل نام ضرور لکھ دینا چاہئے۔ مثلاً وفیات الاعیان: ابن خلکان، قاہرہ سنتہ کذا۔

خاتمہ

یہ وہ عام اصول ہیں جن کی پیروی اشاعتِ متن کے سلسلہ میں کرنی چاہئے۔ ہم نے وہ سیدھا سادہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ جس میں نہ مستشرقین کی کورانہ تقلید ہے اور نہ وہ بے راہ روی اور فقدان اصول جس کے شکار ہمارے ملک کے ناشرین رہے ہیں۔ جن مددگار علوم کے جاننے کی ضرورت تحقیق کے سلسلہ میں ہوتی ہے جیسا کہ ہم نے تمہید میں ذکر کیا ہے۔ اس کی بحث کسی آئندہ اشاعت میں پیش کی جائے گی۔

حوالے اور حواشی

۱۔ ادارۂ غیوم بودہ نے ان اصولوں کو ذیل کی کتابی شکل میں مرتب کر دیا ہے جو عربی متن کی اشاعت کے ضمن میں ان کے پیش نظر رہے ہیں: R. Blachere at J. Sauvaget, Regles Pour edtion at traductions de teste arahes, Paris 1945.

۲۔ تاریخ دمشق چوں کہ ضخیم کتاب تھی اس لئے اس وقت یہی طے ہوا تھا۔ لیکن صورت حال میں حتی الوسع تخریج ہوگی (مترجم)

۳۔ تاریخ مدینۃ دمشق (ادارہ کی تحقیق)، مقدمہ ج ۱، دمشق ۱۹۵۱ء

۴۔ دیکھئے کتاب ''الشفا'' منطق بحث مدخل، مقدمہ ڈاکٹر مذکور ص ۳۸۔۴۲ (قاہرہ ۱۹۵۳ء)

۵۔ دیکھیے مجلۃ ''الثقافۃ'' عدد ۲۷۷ و ۲۸۰۔ ۱۹۴۴ء

۶۔ عبدالسلام ہارون: تحقیق النصوص ونشرہا (قاہرہ ۱۹۵۴ء)

۷۔ دیکھیے مقالہ ڈاکٹر یوسف: ''العش عن التدوین والمعاجم، مجلۃ المجمع العلمی، دمشق جلد ۱۶، صفحہ ۴۲۲، ۱۹۴۱ء۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا تدوین سے متعلق مضمون جو ''صحیفۃ ہمام بن منبہ'' کی اشاعت کے وقت زیر قلم آیا تھا، سابق مجلہ جلد ۲۸، ص ۹۶۔ حبیب الزیات کا مضمون ''الوارفۃ الوارقین'' ''مجلۃ المشرق'' جلد ۴۱، ص ۳۰۵۔ کورکس عواد کا مضمون ''الکاغذ والورق'' مجلۃ المجمع العلمی، دمشق، جلد ۲۳، ص ۴۰۹ اور مجلۃ سومر۔

۸۔ یہ حقیقت ہے کہ اکثر علماء اپنی تالیفات اول اول کسی اور شکل میں پیش کرتے ہیں بعد ازاں حک و اصلاح کرتے ہیں۔ ابن عساکر کی ''تاریخ دمشق'' کے دو قسم کے نسخے متداول ہیں، نئی دریافت جو اسی ۸۰ رجلدوں میں ہے اور قدیم ۵۷ رجلدوں میں ''دریافت الاعیان'' کے بھی دو نسخے رائج ہیں۔ ''کتاب الروضتین'' کے دو

نسخے ملتے ہیں، ایک قدیم دوسرا جدید جو زیادہ معتبر سمجھا جاتا ہے۔ مؤلفین کے سیرت نگار بعض اوقات تصانیف کے ادوار کا بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ یا کبھی مؤلف بہ نفسِ خود اپنی تصنیف کے آخر میں اس کا ذکر کرتا ہے۔

۹۔ استاد ہارون نے ابن کثیر سے ایک اہم عبارت اس سلسلے میں نقل کی ہے۔

۱۰۔ صلاح الدین صفدی، مقدمہ "الوافی بالوفیات"، ج، (تحقیق ھ۔ ریتر استنبول ۱۹۳۴ء)

۱۱۔ دیکھیے مخطوطہ "الحسینی فی الزیل علی العبر" (مخطوطہ عارف حکمت، مدینہ)

۱۲۔ دیکھیے ابن عساکر: معجم الشیوخ النبل (مخطوطہ ظاہریہ، دمشق خالدیہ قدس) مقدمہ میں تصریح ہے "وجعلت لکل واحد من ہولا، حرفا یدل علیہ، تخفیفاً علی الکاتب العجل" (جلد باز کاتبوں کی آسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان میں سے ہر ایک کے لئے ایسا حرف مقرر کر دیا ہے جو اصل کا پتہ دیتا ہے۔) پھر فرماتے ہیں: لان الاجزاء تنوب عن الجمل (یہ مختلف اجزاء جملوں کے قائم مقام ہیں۔)

۱۳۔ کتاب میں کسی لفظ پر حرکات کے اظہار کو عربی میں شکل دینا کہا جاتا ہے اعراب آخر لفظ کی حرکت کو ظاہر کرتا ہے (مترجم)

۱۴۔ فاصلہ کی جمع ہے۔ یہ سجع میں بالکل اس طرح مستعمل ہوتا ہے جیسے اشعار میں قافیہ (مترجم)

۱۵۔ اس سے مراد غالباً وہ عبارت ہے جو مصنف ضمیمہ کے طور پر آخر کتاب میں لکھ دیتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ غلطیوں کی وہ اصلاح شدہ شکل ہو جو اکثر مطالعہ کرتے وقت علماء کے ذریعہ عمل میں آتی ہے۔ چوں کہ عنوان کی شکل میں لکھا گیا ہے اور کوئی تفصیل درج نہیں ہے اس لئے اس کا قطعی تعین مشکل ہے۔ (مترجم)

فہرستِ اسنادِ محولہ

۱۔ ابنِ سینا "شفا"، طبع اوّل، نشر وزارۃ المعارف العمومیۃ الادارۃ العامۃ الثقافۃ، قاہرہ، ۱۳۷۱ھ بہ مطابق ۱۹۵۳ء

۲۔ ابنِ عساکر "تاریخ دمشق"، جدید، ۸۰ جلدیں، بیروت، دار الفکر للطباعۃ والنشر التوزیع ۱۴۱۵ھ

۳۔ ابنِ عساکر "تاریخ دمشق"، قدیم، ۵۷ جلدیں۔ www.ahlalhadeeth.com

۴۔ ابنِ عاتی "قوانین الدواوین"

۵۔ ادارہ "تاریخ مدینۃ دمشق"، جلد اوّل، دمشق، ۱۹۵۱ء

۶۔ "وفیات الاعیان"، قم، منشورات الشریف الرضی

۷۔ صلاح الدین صفدی "الوافی بالوفیات" ج، تحقیق ھ ریتر، استنبول ۱۹۳۴ء

۸۔ المقدسی، ابوشہاب الدین عبدالرحمٰن بن اسماعیل: "کتاب الروضتین"، جدید، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۲۲ء

۹۔ "کتاب الروضتین"، قدیم www.alwarraq.com

مخطوطات:

۱۔ مخطوطہ "الحسینی فی الزیل علی الصر" (مخطوطہ عارف حکمت، مدینہ)

۲۔ مخطوطہ، ''ظاہریہ''، دمشق خالدیہ قدس۔

مجلّات:

۱۔ ''مجلّہ الثقافۃ''، عدد ۲۷۷۔۲۸۰، ۱۹۴۰ء
۲۔ ''مجلّہ المجمع العلمی''، جلد ۱۶، ۲۳، ۲۸۔
۳۔ ''مجلّۃ المشرق''، ج ۴۱، بیروت، ۱۹۰۲ء۔
۴۔ ''مجلّہ سومر''۔

☆☆☆

انجمن اسلام اردو کا ایک ممتاز تعلیمی وثقافتی ادارہ ہے جس نے جسٹس بدرالدین طیب جی، محمد علی روگھے (دوم)، عبداللہ دھرمسی، سیف طیب جی، بیرسٹر اکبر پیر بھائی، معین الدین حارث اور مصطفےٰ فقیہ جیسی دانشورانہ اور فعال شخصیتوں کی رہنمائی میں تعلیم اور اردو کے کارواں کو بمبئی اور اطرافِ بمبئی میں فروغ دیا اور صوبۂ بمبئی سے باہر کی اردو دنیا کو بھی متاثر کیا۔

انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، انجمنِ اسلام کا ایک ثقافتی و ادبی ادارہ ہے اور اس کی شناخت ہندوستان گیر ہی نہیں بلکہ عالمگیر ہے۔ یہ ادارہ ہندوستان کی آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں قائم کیا گیا تاکہ اردو زبان وادب سے متعلق اپنی خدمات پیش کرے۔ انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں سابق صدر انجمن اسلام مرحوم سیف طیب جی، سابق پرنسپل اسمٰعیل یوسف کالج ڈاکٹر محمد بذل الرحمن، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار اور مشہور دانشور و ماہرِ قانون پروفیسر آصف علی اصغر فیضی کی مساعیٔ جمیلہ شامل ہیں۔ ممتاز محقق اور عالم پروفیسر نجیب اشرف ندوی اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے بانی ڈائرکٹر اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اس کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔ نامور محقق مرحوم عبدالرزاق قریشی بھی اسی دور میں ادارے سے وابستہ رہ کر اس کے علمی کاموں کو مہمیز کرتے رہے۔ مرحوم کی زیرِ نظر کتاب کے علاوہ قریشی صاحب کی دیگر مطبوعات کے نام یہ ہیں: ''نوائے آزادی'' (مؤلفہ)، ''مرزا مظہر جان جاناں (مؤلفہ)، ''مکاتیبِ مرزا مظہر'' (مرتبہ)، ''راگ مالا'' (مؤلفہ) اور ''اردو زبان کی تمدنی اہمیت''۔

اس ادارہ کا بنیادی مقصد بمبئی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی عدم موجودگی میں اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کے ساتھ اردو میں قدیم اردو میں تحقیقات کرنا اور اسی طرح نت نئے تحقیقی کاموں کو فروغ دینا ہے۔ 'نوائے ادب' اس کا تحقیقی مجلہ ہے جسے اردو دنیا میں علمی وادبی اعتبار حاصل ہے۔ —ادارہ

عبدالرزاق قریشی صاحب، ضلع اعظم گڑھ میں بستی بسہم کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد قریشی صاحب بمبئی تشریف لائے اور انجمن اسلام ہائی اسکول میں درس و تدریس سے وابستہ ہوئے۔ وہ انجمن اسلام اسکول کے ممتاز اور معروف اساتذہ میں سے تھے۔ انھیں اردو زبان وادب اور اسی طرح فارسی زبان سے بھی شغف تھا اور درس وتدریس کے ساتھ وہ زبان وادب کی تحقیق میں مصروف رہتے تھے۔ اس زمانے میں بمبئی کے اردو کے اساتذہ میں تین (۳) اساتذہ اپنی زبان دانی اور درس و تدریس میں مہارت اور طلبا کی ذہنی تربیت اور ادبی ذوق وشوق کو پروان چڑھانے میں مشہور تھے۔ ان میں قریشی صاحب کے علاوہ احمد سیلر اسکول کے استاد محمد بشیر صاحب اور بیگ محمد کے فاضل استاد مولانا جالب مظاہری کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تینوں اساتذہ کو اسکولی سطح کی اردو اور تاریخ کی تدریس کے لئے شہرت حاصل تھی۔